تحقیقی مقالہ برائے ایم۔ایس۔اُردو

غیر افسانوی ادب میں سقوطِ ڈھاکہ کی عکاسی

بحوالہ خصوصی مسعود مفتی اور صدیق سالک

محقق

ماریہ بتول

214-FLL/MSURDU/S17

نگران

ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو

شعبۂ اُردو

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

International Islamic Univ.
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD

Accession No
MS
891.4398
مراغ
اردو ادب ۔ نثر
" " ۔ سقوطِ ڈھاکہ

الجامعة الإسلامية العالمية

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

شعبۂ اُردو

تصدیق نامہ

تصدیق کی جاتی ہے کہ ماریہ بتول رجسٹریشن نمبر214-FLL/MSURDU/S17 نے ایم۔ایس۔اُردو کی ڈگری کی تکمیل کے لیے مقالہ بعنوان **"غیر افسانوی ادب میں سقوطِ ڈھاکہ کی عکاسی: بحوالہ خصوصی مسعود مفتی اور صدیق سالک"** رقم کیا ہے۔ میں تصدیق کرتی ہوں کہ اس موضوع پر اس سے پہلے کہیں کام نہیں ہوا اور یہ کام سرقے سے پاک ہے۔

نگران: ڈاکٹر غلام فریدہ

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو

بسم الله الرحمن الرحيم

اظہارِ تشکر

تحقیقی مقالے کی تیاری طالب علم کی زندگی کا اہم ترین مرحلہ ہے۔ تحقیقی کام کی ابتدا سے قبل اس کے موضوع کا انتخاب بہت سوچ وبچار کا متحمل ہوتا ہے۔ اس میں طالب علم کی دلچسپی اور موضوع کی اہمیت دونوں کو مدِ نظر رکھا جائے تو ایک بہترین تحقیقی مقالہ تیار کیا جا سکتا ہے۔ اپنے ایم۔ ایس کے کورس ورک کی تکمیل کے بعد تحقیقی موضوع کا انتخاب ہم سب ساتھی طالبات کے لئے ایک مشکل مرحلہ تھا۔ جس کو مکمل راہنمائی کی ضرورت تھی۔ ایس میں ہم سب ہمارے شعبہ اردو کی صدر پروفیسر ڈاکٹر نجیبہ عارف صاحبہ سے وقتاً فوقتاً ملتے اور مشورہ کرتے رہے۔ منفرد کام کرنے کی صلاحیت کے تحت انہوں نے مخلصانہ مشورہ دیا کہ اگر آپ قابلِ قدر کام کرنا چاہتی ہیں، تو ججوں یا آرمی افسران کی آپ بیتیوں پر تحقیقی کام کریں۔ آپ بیتی میں ذاتی دلچسپی کی بنیاد پر میں نے دو ایسے فوجی افسران کا انتخاب کیا، جو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں بطور فوجی اپنی خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ ڈاکٹر نجیبہ نے ایک فوجی افسر کا نام کاٹ کر ایک سول سرونٹ مسعود مفتی صاحب کا نام شامل کیا اور یوں مجھے مسعود مفتی اور بریگیڈیئر صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر کا سقوطِ ڈھاکہ کے تناظر میں جائزہ لینے کا مشورہ دیا۔ یوں ان کی توجہ سے مجھے ایک دلچسپ موضوع تحقیق کے لئے میسر آ گیا۔

اپنے تحقیقی موضوع غیر افسانوی ادب میں سقوطِ ڈھاکہ کی عکاسی: بحوالہ خصوصی مسعود مفتی اور صدیق سالک میں، میں نے مسعود مفتی کی تین کتب لمحے، ہم نفس، چہرے اور مہرے اور صدیق سالک کی ہمہ یاراں دوزخ، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا اور سیلوٹ کا انتخاب کیا۔ اس تحقیقی مقالے کی نگرانی شعبہ اردو کی نہایت مشفق اور قابلِ قدر استاد ڈاکٹر غلام فریدہ کے سپرد تھی۔ ڈاکٹر نجیبہ عارف اور ڈاکٹر غلام فریدہ کی نگرانی میں اس مقالے کو پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا۔ پہلا باب سقوطِ ڈھاکہ کا پس منظر کے عنوان سے ہے۔ اس میں پاکستان بننے کے بعد سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک کے اہم واقعات و محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جس سے سقوطِ ڈھاکہ کے اہم سانحے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

دوسرا باب سقوطِ ڈھاکہ کے واقعات کی پیش کش اور نوعیت کا جائزہ کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں زیرِ تحقیق کتب میں پیش کردہ واقعات کا جائزہ اس انداز میں لیا گیا کہ مصنفین کے مخصوص اسلوب اور اندازِ تحریر کو اہمیت دی گئی۔ واقعات کا چناؤ، ترتیب و تسلسل، واقعات کا بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر لینا ان تمام عوامل کے تحت واقعات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ تیسرا باب سقوطِ ڈھاکہ کے متعلق نظریاتی

مباحث کا تقابلی جائزہ کے عنوان سے ہے۔اس میں مسعود مفتی اور صدیق سالک کے سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے اپنی کتب میں پیش کردہ نظریات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔شکست کے سیاسی، معاشی، تعلیمی، ثقافتی، نظریاتی عوامل کو مصنفین کے تجربات کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔چوتھا باب واقعات کے بیان و اسلوب کا تقابلی جائزہ کے عنوان سے ہے۔اس باب میں مسعود مفتی اور صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر کا تجزیہ کرتے ہوئے کردار نگاری، حقیقت نگاری، منظر نگاری، تشبیہات، علامات واستعارات، محاورات اور دیگر ادبی وفنی خوبیوں کو دیکھا گیا ہے۔ماحصل میں مقالے کے بنیادی سوالاتِ تحقیق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نتائج مرتب کئے گئے ہیں۔

اس مقالے کی تکمیل کے لئے میں سب سے پہلے شکر گزار ہوں اس ہستی کی جو ساتوں آسمانوں ساتوں زمینوں اور ان کے درمیان موجود کل کائنات کا مالک ہے۔ جس نے مجھے ان انعام یافتہ لوگوں کی فہرست میں شامل کیا جو لکھنے پڑھنے جیسی مقدس نعمت سے واقفیت رکھتے ہیں۔اس کی مہربانی ہر مقام پر میری مشکلات کے ساتھ آسانیاں مہیا کرتی رہی یوں اس کی رحمت کے سائے میں میں نے اپنا تحقیقی کام بخوبی پایہ تکمیل تک پہنچایا۔

خدا کی ذات کے بعد میں نہایت احترام اور دل کی تمام محبتوں کے ساتھ اس ہستی کے حضور شکریہ پیش کرتی ہوں جن کے لئے کل کائنات تخلیق کی گئی ہے۔آپؐ کی ذات پاک کی نگاہ کرم نے ہمیشہ مجھے سنبھالا دیا۔ جہاں میری زندگی کے ہر مرحلے میں

میں نے جب بھی انہیں پکارا ہے
اک صدا آئی تو ہمارا ہے

کے مصداق آپؐ کی ذات گرامی کے ساتھ نسبت نے مجھے حوصلہ عطا کیا وہیں تحقیقی مقالے کی تکمیل میں بھی میری ٹوٹتی ہمت کو درود پاک نے بڑھایا۔آپؐ کی شانِ گرامی کے حضور مجھ ناچیز کا سر احساسِ تشکر میں ہمیشہ جھکا رہے گا۔

اس کے بعد میں اپنے والدین اور اساتذہ اکرام کی نہایت ممنون ہوں جن کی کاوشوں نے مجھے اس مقام تک پہنچایا۔ میری والدہ جنہوں نے ہر ممکن طریقے سے میرے لئے آسانیاں پیدا کیں اور ہر دفعہ میرے پست حوصلوں کو بلند کیا۔ میرے والد جن کے مظبوط کندھوں نے ہر لمحے مجھے سنبھالا اور میری ذات کو اعتماد کی دولت سے نوازا۔ میری زندگی کی ان دو شمعوں نے ہمیشہ میرے راستے روشن رکھے۔ میری ذات ہمیشہ ان کی مشکور رہے گی اور میں ان کے وجود کا حصہ ہونے پر فخر محسوس کروں گی۔ میرے اساتذہ اکرام جن میں، میں ڈاکٹر نجیبہ عارف جیسی قابلِ قدر اور مہربان استاد کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنی زیرک نگاہی سے میری دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے موضوع کے انتخاب جیسے کٹھن مرحلے میں میری مدد کی۔ میں بے انتہا ممنون ہوں اپنی نگران ڈاکٹر غلام فریدہ کی

جنہوں نے ضرورت کے ہر لمحے میں میرے ساتھ رابطہ قائم کیا۔ تحقیقی کام کے سلسلے میں پیش آنے والی ہر مشکل میں میرے ساتھ شریک رہیں۔ میں نے تحقیقی کام کے اس مشکل مرحلے میں ہر لمحہ انہیں اپنے ساتھ کھڑا پایا۔ میں ان کی اس قدر توجہ اور راہنمائی کے لئے ہمیشہ احسان مند رہوں گی۔

اس کے بعد میں شکر گزار ہوں اپنے بہن بھائیوں اور دوستوں کی جنہوں نے ہر گزرتے لمحے مجھے کبھی دوستانہ تو کبھی تنبیہی انداز میں اپنے کام کی طرف توجہ دینے کو کہا۔ میں بہت ممنون ہوں نیشنل لائبریری اسلام آباد، اکادمی ادبیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اشرف بک ایجنسی، اولڈ بک ہاؤسز میں موجود ان نگران کی جنہوں نے کتب ڈھونڈنے میں میری مدد کی۔ میں شکر گزار ہوں ریسرچ آفیسر انیس علی شاہ صاحب کی جنہوں نے سقوطِ ڈھاکہ کے عینی شاہدین تک رسائی میں میری مدد کی۔ میں شکریہ ادا کرتی ہوں عینی شاہد حاجی نصیر الدین صاحب، محمد دل شیر علی انصاری صاحب اور عبدالرؤف صاحب کا جنہوں نے اپنے دردناک ماضی میں جھانکتے ہوئے مجھے ۱۹۷۱ء کے حالات و واقعات سے آگاہ کیا۔ خصوصی شکریہ ادا کرتی ہوں عاصمہ نذیر صاحبہ کا جنہوں نے مقالے کے تکنیکی مراحل میں میری مدد کی۔

میں امید کرتی ہوں ان سب لوگوں کی مخلص کوشش اور دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی۔

ماریہ بتول

۲۸ دسمبر ۲۰۱۹ء

ACCEPTANCE BY THE VIVA VOCE COMMITTEE

Name of the Student: **Maria Batool**

Title of the Thesis: غیر افسانوی ادب میں سقوطِ ڈھاکہ کی عکاسی، بحوالہ خصوصی مسعود مفتی اور صدیق سالک

Registration No: 214-FLL/MSURDU/S17

Accepted by the Department of Urdu, Faculty of Languages & Literature, International Islamic University, Islamabad, in partial fulfillment of the requirements for the Master of Philosophy degree in Urdu.

VIVA VOCE COMMITTEE

Chairperson Viva Committee:

Dr. Humaira Ishfaq
Chairperson Department Of Urdu Female IIUI

External Examiner:

Dr. Naeem Mazhar
Associate Professor
NUML University, Islamabad

Internal Examiner:

Dr. Sadia Tahir
Assistant Professor, Urdu University
Department Of Urdu, Islamabad

Supervisor:

Dr. Ghulam Fareeda
Assistant Professor Department Of Urdu
Female IIUI

BE150821

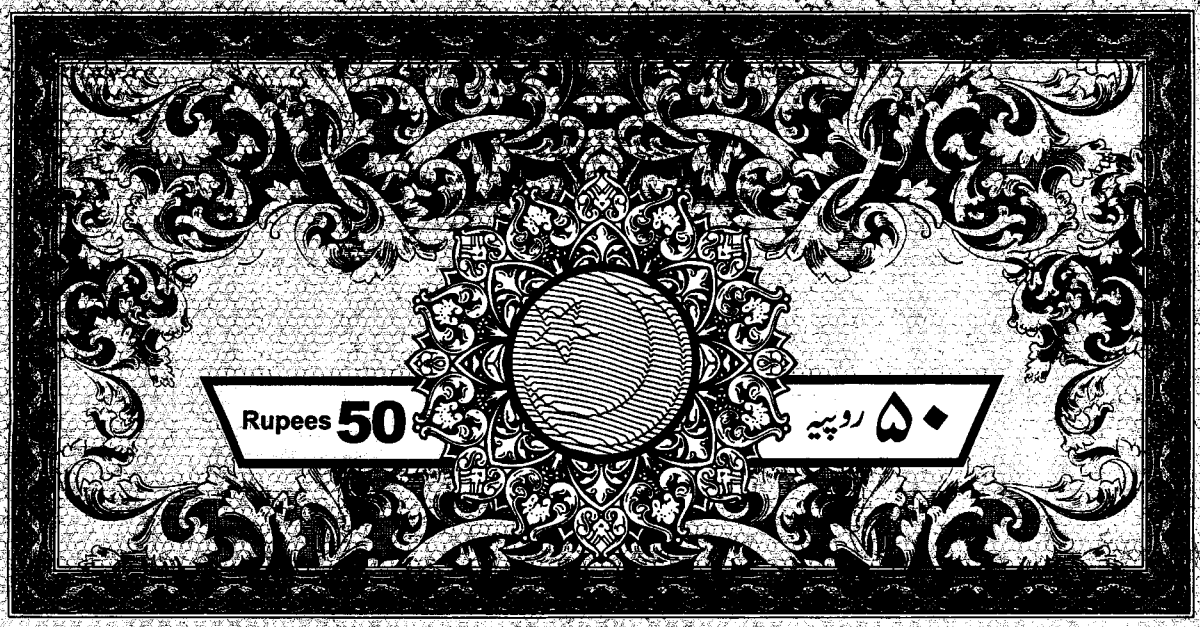

بیان حلفی

میں مسماۃ مایہ بتول دختر محمد حفیظ رجسٹریشن نمبر 214-FLL/MSURDU/S17
حلفاً اقرار کرتی ہوں کہ میرا مقالہ بعنوان "غیر افسانوی ادب میں سقوطِ ڈھاکہ کی عکاسی : بحوالہ خصوصی مسعود مفتی اور صدیق سالک" سرقے سے پاک ہے اور اس مقالے میں مکمل اور اصل حوالہ جات دیئے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان میرے علم و یقین کے مطابق درست اور صحیح ہے۔ اس میں کوئی امر مخفی نہیں رکھا گیا ہے۔

مقالہ نگار

مایہ بتول

Attested By
Malik Imran Ali
Oath Commissioner
Appointed w.e.f 10-04-19 To 09-04-22
Fresh/Appointment
Jand Distt. Attock.

فہرست موضوعات

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
	پیش لفظ	
۱۔	باب اوّل:	
	سقوطِ ڈھاکہ کا پس منظر	۱
۲۔	باب دوم:	
	سقوطِ ڈھاکہ کے واقعات کی نوعیت اور پیش کش کا جائزہ	۲۲
۳۔	باب سوم:	
	سقوطِ ڈھاکہ کے متعلق نظریاتی مباحث کا تقابلی جائزہ	۸۵
۴۔	باب چہارم:	
	واقعات کے بیان واسلوب کا تقابلی جائزہ	۱۲۲
	ماحصل	۱۵۱
	کتابیات	۱۵۸
	ضمیمہ جات	۱۶۱

باب اوّل

سقوطِ ڈھاکہ کا پس منظر

باب دوم

سقوطِ ڈھاکہ کے واقعات کی نوعیت اور پیش کش کا جائزہ

باب سوم

سقوطِ ڈھاکہ کے متعلق نظریاتی مباحث

کا تقابلی جائزہ

باب چہارم

واقعات کے بیان واسلوب کا

تقابلی جائزہ

ماحصل

کتابیات

ضمیمہ جات

باب اوّل:

سقوطِ ڈھاکہ کا پس منظر

مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کا قیام، پاکستان کی تاریخ کا ایسا ہولناک سانحہ ہے جس نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی جغرافیائی، سیاسی، عسکری اور معاشی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اگرچہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو اس وقت کی سیاسی اور عسکری قیادت سے سرزد ہونے والے غلط فیصلوں کا نتیجہ تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم اس کے پس پردہ کئی سالوں کی سازشی کارروائیاں اور ایسے تلخ حقائق موجود ہیں جو قیام پاکستان کے فوراً بعد سے اس مملکت میں انتشاری رویوں کو تحریک دینے کا باعث بنے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا یہ سانحہ تاریخ میں سقوطِ ڈھاکہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بنگلہ دیش کی موجودہ سرحد ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کے موقع پر وجود میں آئی تھی۔ اس وقت پاکستان کا یہ حصہ مشرقی پاکستان کہلایا۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو موجودہ بنگلہ دیش کا شہر ڈھاکہ صدیوں سے اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز رہا ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں پاکستان کی واحد نمائندہ جماعت مسلم لیگ کا قیام ۱۹۰۶ء میں عمل میں آیا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان پیش کرنے والے مولوی اے۔کے فضل الحق کا تعلق بھی اِسی علاقے سے تھا۔ جغرافیائی طور پر یہ ایک عجیب و غریب خطہ تھا کیوں کہ اس کے دونوں بازو ایک دوسرے سے بارہ سو میل دور تھے اور بد قسمتی سے یہ بارہ سو میل کا علاقہ ہمارے روایتی حریف بھارت کا علاقہ تھا۔ اس کی تاریخ کو دیکھیں تو مسلمانوں کو انگریزوں اور ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرانے میں جن لوگوں کا ہاتھ رہا ہے، اُن میں سے بہت سے اہم نام اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

تحریک پاکستان کے کارکنان میں سے بہت سے سیاسی طور پر بالغ اور صاحب نظر انسان اس علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ بنگلہ دیش مشرقی پاکستان کی حیثیت سے پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم حصہ تھا۔ یہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کی زمین کی نمی نے ہمیشہ اس علاقے کو جنگی سرزمین کے حوالے سے ناسازگار ٹھہرایا ہے۔ اس علاقے کے لوگ نسلی گروہ کے اعتبار سے مختلف تھے اور ان کا تعلق وسطی ایشیاء سے آنے والے آریاؤں سے جاملتا تھا۔ یہ لوگ رنگت کے لحاظ سے سانولے اور چھوٹے قد کے مالک تھے۔ نسلاً جنگجو قسم کے لوگ تھے مگر انگریز حکومت کے تسلط میں رہ کر ان کا کام صرف کھیتوں کھلیانوں تک محدود رہ گیا تھا۔ یہ علاقہ ندی، نالوں اور دلدلی جنگلوں سے بھرپور تھا جہاں

انسان کو اپنی بقا کی خاطر بہت کڑی جنگ لڑنا پڑتی ہے۔ چنانچہ اس علاقے کے باشندوں کو زندہ رہنے کے لیے بڑی تگ و دو کرنا پڑتی تھی۔ یہاں کے مسلمانوں نے آزادی کی جنگ میں کبھی بھی اپنے مغربی حصے کے مسلمان بھائیوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ثقافت، رنگ، نسل، تہذیب، لباس اور خوراک کی تفریق کے باوجود ایک طاقت ایسی تھی جو ان کو باہم جوڑ کر رکھے ہوئے تھی۔ یہی محرک قوت قیام پاکستان کا سبب بنی۔ اس علاقے کے لوگوں کی ثقافت، لباس، رہن سہن سب مغربی خطے سے مختلف تھا اور موسیقی، رقص اور شاعری سے لگاؤ انہیں بنگالی ہندوؤں سے قریب کرتا تھا مگر اس سب کے باوجود پاکستان کے قیام کے لئے یہاں کے لوگوں نے ہمیشہ اپنا مکمل اور فعال کردار ادا کیا۔ مذہب کی طاقت نے ان کو ہمیشہ ایک الگ وطن کے مطالبے پر یکجا رکھا۔

قیام پاکستان کے حوالے سے کی گئی جدوجہد میں بنگالی مسلمان کہیں بھی اپنے مقاصد سے روگردانی کے مرتکب نہیں ٹھہرے تھے۔ تاہم اپنی تمام تر وفاداریوں کے باوجود یہ لوگ اندرونی اور بیرونی سازشوں کا شکار ہوئے۔ جس کے نتیجے میں ان میں شدید قسم کے احساس کمتری اور قومی عدم تحفظ کے احساس نے جنم لیا۔ اس حوالے سے کمال متین الدین نے اپنی تصنیف *Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968-1971* جس کا ترجمہ محمد شیر ازدستی نے بعنوان نسلوں نے سزا پائی، بحران ڈھاکا ۱۹۶۸ء۔۱۹۷۱ء کے نام سے کیا میں کہتے ہیں:

> کسی بھی طرح عوامی عدم مماثلت نے بنگالیوں کی پاکستان سے وفاداری کو نہ بدلا ہوتا اگر انہیں کم تر سمجھا جاتا یا انہیں ان کے جائز حقوق سے محروم نہ رکھا جاتا۔[1]

یہ انتشاری رویے محض چند دنوں اور چند مہینوں کے نتیجے میں ظہور پذیر نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ قیام پاکستان سے قبل بھی ہندو اور مغربی طاقتیں یہ نہیں چاہتی تھیں کہ مسلمان ایک آزاد ریاست میں سانس لیں۔ ایسی صورتحال میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس خطے کے امن کو برقرار رہنے دیتے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد سے ہندوؤں کی یہ کوشش رہی کہ اس خطے کے امن کو تباہ کر کے اس کو دوبارہ ہندوستان میں ضم کر دیا جائے اور اس کام کیلئے دشمن نے بہت لمبی سازشوں کا تانا بانا بنا تھا۔ جو چوبیس سال کے عرصے پر محیط تھا۔

قیام پاکستان کے بعد مشرقی اور مغربی دونوں خطوں کے درمیان قریباً ایک ہزار میل کا زمینی فاصلہ موجود تھا۔ یہ وہ علاقہ تھا جو حالت جنگ تو کیا حالت امن میں بھی پاکستان کے تحفظ کیلئے خطرہ تھا۔ قائداعظم کی کوشش تھی کہ ان کے درمیان زمینی راستہ ہندوستان سے گزر کر جائے مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ مشرقی و مغربی پاکستان کا قیام کسی زمینی رابطے کے بغیر ایک متحدہ ملک کی حیثیت سے وجود میں تو آگیا تاہم ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۱ء تک ایسے بہت سے سازشی

حالات و واقعات نے جنم لیا جو ان دونوں خطوں کی جدائی کا سبب بنے تھے۔ قرارداد پاکستان ۱۹۴۰ء میں "ریاستیں" کا لفظ غلطی سے شامل ہو گیا تھا۔ مگر بعد کے حالات نے ان علاقوں کی علیحدگی سے دشمن کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ وہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان کی اس غلطی کو درست مانیں کہ یہ دونوں ہمیشہ سے الگ ریاستیں ہی تھیں۔

قیام پاکستان کے بعد سے ہی اس کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو گیا تھا اور اس کی رہی سہی کسر مشرقی پاکستان میں موجود ہندوؤں کی سازشوں نے پوری کر دی تھی۔ بھارت، پاکستان کے قیام کے بعد سے ہی یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ ملک کسی بھی طرح زیادہ عرصہ تک قائم رہ سکے اس لئے اس نے حتیٰ الامکان کوشش کی کہ معاشی و جغرافیائی ناانصافی سے تقسیم ہند کا مرحلہ مکمل ہو۔ مشرقی پاکستان میں صنعت و تجارت اور تعلیم کا شعبہ ہندوؤں کی نگرانی میں تھا اس لیے انہوں نے جہاں تک ممکن ہوا اس خطے کے لوگوں میں قومیت پرستی کو ہوا دی۔ بقول عنایت اللہ:

> بھارت اور علیحدگی پسند عناصر نے یونیورسٹی کو خاص طور پر پروپیگنڈے کا نشانہ بنایا۔ یہی وجہ تھی کہ طلبا میں علیحدگی کی تحریک زیادہ شدید تھی۔ مجیب انہی کا لیڈر تھا اور وہ طلبا کے کچے ذہنوں میں مغربی پاکستان کے خلاف خوب زہر بھر رہا تھا۔[۲]

قیام پاکستان کے بعد مشرقی علاقے میں ۹۰ فیصد سے زائد اساتذہ ہندو تھے جن کا بنیادی مقصد بنگالی مسلمانوں میں علاقائی تحفظ کی آڑ میں قومیت کے جذبے کو ابھارنا تھا۔ وہ نسل جو قیام پاکستان کے وقت کم سن تھی ۱۹۷۱ء تک ایک ایسی نوجوان نسل کی صورت اختیار کر چکی تھی، جس کو اشتعال دلا کر الگ ریاست کے مطالبے کی طرف مائل کرنا مشکل کام نہ تھا۔ وہ بنگلہ دیش کے قیام کے لیے سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھے۔ اسی نسل میں پاکستان کی علیحدگی کے لیے سرگرم عناصر میں مرکزی کردار کی حیثیت سے شیخ مجیب الرحمن بھی شامل تھے۔ جنھوں نے مختلف وجوہات کو بنیاد بنا کر بنگلہ دیش کے قیام کیلئے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے جن کا ذکر ہمیشہ تاریخ کے اوراق پر بوجھ رہے گا۔

اپنی زبان سے وابستگی کسی بھی قوم کی سالمیت کے لیے ہمیشہ سے اہمیت کی حامل رہی ہے۔ برصغیر پاک و ہند ایک ایسا علاقہ ہے جہاں صدیوں سے زبانوں کا ادغام عمل میں آتا رہا ہے جس سے نئی زبانیں فروغ پاتی رہی ہیں۔ اسی علاقے میں اردو ہندی تنازعہ بھی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اسی سلسلے کی ایک اور اہم کڑی اردو بنگالی تنازعہ ہے جسے بنگالیوں نے اپنے جداگانہ تشخص کے تحفظ کے لیے کھڑا کیا تھا۔ مغربی پاکستان سے اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا بہت ضروری تھا مگر ایسا نہ ہو سکا۔ پروفیسر رفیع اللہ شہاب لکھتے ہیں:

> ۲۵ فروری ۱۹۴۸ء کو مسٹر جناح نے قانون ساز اسمبلی میں ایک بیان دیا کہ ایک مسلمان ملک ہونے کے ناطے پاکستان کی ریاستی زبان اردو ہو گی۔[۳]

فروری ۱۹۴۸ء میں بنگالی کو اردو زبان کی طرح سرکاری زبان کا درجہ دیئے جانے کا تنازعہ سامنے آیا جو کوئی قابل عمل حل نہ نکلنے کی بنا پر ۱۹۵۱ء تک مشرقی پاکستان میں فسادات کی صورت میں سامنے آیا۔ ۱۹۵۲ء میں جب قائداعظم کے اعلان کے مطابق دستور ساز اسمبلی نے اردو کو ملک کی قومی زبان کا درجہ دینے کا فیصلہ کیا تو اس کے نتیجے میں حالات ہڑتالوں اور جلسے جلوس تک جا پہنچے اور بالآخر اس کا نتیجہ ۱۹۵۴ء میں مسلم لیگ کی انتخابات میں ناکامی کی صورت میں سامنے آیا۔ دشمن کی نظریں ایسے ہی مواقع تلاش کر رہی تھیں چنانچہ انہوں نے اپنی سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے بنگالی لٹریچر کو عام کرنا شروع کر دیا۔ اس سے قبل سازش کا ایک مہرہ ہندو اساتذہ کی صورت میں مشرقی پاکستان میں پہلے سے موجود تھا مگر وقت و حالات کے ساتھ ساتھ دشمن اپنی چالوں کا رخ متعین کر رہا تھا۔

۱۹۵۶ء کا آئین آیا تو اس میں بنگالی کو بھی قومی زبان کی حیثیت دی گئی تھی مگر اس وقت صورتحال قابو سے باہر ہو گئی تھی۔ نفرت اور دوری کا بیج جسے ایک تیسری پارٹی کی حیثیت سے ہندوؤں نے بویا تھا اس کی فصل کی کٹائی میں اپنے ہی ملک کے دشمن عناصر بھی مددگار تھے۔ پاکستانی حکمرانوں کی ناکام پالیسیاں، وزارت کے لالچ اور اقتدار کی ہوس ملک کو اس نہج پر لے آئی تھی جہاں کوئی سیاسی حل نکالنا بہت مشکل محسوس ہو رہا تھا۔ بنگالیوں کو ہر سطح پر اس بات کا احساس رہا تھا کہ ان کو اقلیت کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے اور ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جا رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے ان میں یہ احساس مزید تقویت پکڑتا چلا گیا۔ دونوں خطوں میں ذہنی فاصلے نے دلوں میں کدورتیں پیدا کر دی تھیں۔ بنگالی قوم سیاسی طور پر بہت بالغ نظر قوم تھی اور ان کو اس بات کا ہمیشہ سے احساس رہا تھا کہ ان کے حقوق کو کہاں کہاں سلب کیا جا رہا ہے۔ مگر اس میں بہت حد تک قصور ان ارباب اختیار کا تھا جو بنگالیوں کی سوچ سے قطع نظر کرسی کی جنگ میں مصروف تھے۔

۱۹۵۳ء میں آنے والے بنگال کے قحط نے بھی ان کے احساس محرومی کو مزید بڑھا دیا تھا، جب مسلم لیگ ان کی امیدوں پر پورا اترنے میں ناکام رہی تھی۔ ۱۹۵۰ء میں سہروردی کی قیادت میں پاکستان عوامی لیگ کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ مولانا بھاشانی کو پارٹی کا صدر مقرر کیا گیا اور شیخ مجیب الرحمٰن پارٹی کے جوائنٹ سیکٹری کی حیثیت سے منظر عام پر آئے۔ ۱۹۵۳ء میں گورنر جنرل غلام محمد نے جب خواجہ ناظم الدین کو برطرف کیا تو یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس نے مشرقی پاکستان کے لوگوں میں شدید احساس محرومی کو جنم دیا اور انھیں اس بات کا احساس دلایا کہ وہ ہر اعتبار سے مغربی پاکستان کے فیصلوں کے آگے مجبور ہیں۔ ۱۹۵۶ء کے آئین میں جب ون یونٹ کا قیام عمل میں آیا تو اس قدم کو بھی مشرقی پاکستان کی عوام نے مغربی پاکستان کی سازش پر محمول کیا۔ یوں ہر قدم پر احساس محرومی پڑھتا چلا گیا، ہر

گزرتا دن اور واقعہ نفرت کی اس آگ کو بڑھانے میں مہمیز کا کام دیتا گیا جس نے مشرقی اور مغربی خطوں کے لوگوں کو نہ صرف جغرافیائی بلکہ دلی طور پر بھی دور کر دیا۔ ۱۹۵۶ء کے آئین کے بعد حکومتوں میں مستقل مزاجی مفقود ہو گئی تھی۔ آئے روز حکومتیں بنتی اور ٹوٹتی تھیں۔ حالات اس حد تک ابتر ہو چکے تھے کہ ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء لگا دیا گیا اور اس کے نتیجے میں سیاسی عملداری دونوں خطوں میں جمود کا شکار ہو گئی۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں اس سلسلے میں درج ہے کہ:

> ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو فوج نے تمام اہم مقامات پر قبضہ کر لیا اور مارشل لا کا اعلان کر دیا۔ لوگ ۱۹۵۳ء میں مارشل لا کا تجربہ کر چکے تھے لہٰذا سب نے سعادت مندی کے ساتھ یہ سوچ کر اسے قبول کر لیا کہ یہ تھوڑے عرصے قائم رہنے والا مارشل لا ہے۔[۴]

جنرل محمد ایوب خان نے صدارت کا منصب سنبھال لیا تھا۔ مگر مشرقی پاکستان میں حالات جس نفسیاتی، سیاسی اور معاشی کشیدگی کا شکار ہو چکے تھے اس کا حل دونوں خطوں کو جدائی کی طرف لے جا رہا تھا۔ مارشل لاء کی وجہ سے سیاسی سرگرمیوں کو دبانے کا عمل بھی اس کو مزید بھڑکانے کا سبب بنا تھا جو اتنے عرصے سے ملک کے صرف ایک حصے میں سلگ رہی تھی۔ ایوب خان کو اس بات کا احساس تھا کہ ملک کے دوسری طرف کی عوام سیاسی و معاشی محرومی کا شکار ہے اور اس کے حل کیلئے انہوں نے بہت سے مناسب اقدامات کیے۔ ملک دشمن عناصر نے تو یہاں تک کہا کہ مغربی پاکستان معیشت کا زیادہ حصہ خود ہڑپ کر جاتا ہے جبکہ اصل پیداوار کا منبع مشرقی پاکستان ہے۔ مگر یہاں حقائق اس کے برعکس تھے یہ بات درست تھی کہ تقسیم کے وقت سے ہی مغربی پاکستان میں موجود فیکٹریوں اور کارخانوں کی تعداد مشرق کی نسبت بہت زیادہ تھی اور مالدار اور کاروباری لوگ زیادہ تر ہجرت کر کے مغربی پاکستان ہی چلے گئے تھے جس کی بنا پر اس خطے کی سالانہ پیداوار میں ہونے والا اضافہ مشرقی پاکستان کی نسبت زیادہ تھا۔ مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا کہ مشرقی پاکستان کی حق تلفی کی گئی۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو کاروبار اور پیسہ جن چند خاندانوں میں گردش کر رہا تھا وہ گنتی کے بیس بائیس خاندان تھے جو نئی صنعتیں لگانے کی اہلیت رکھتے تھے اور رشوت و اقربا پروری سے اپنا کام نکالنا جانتے تھے۔ ان کے لیے لائسنس بنوانا، اپنی انشورنس کمپنی کھولنا یا کوئی بھی کاروباری کام مشکل نہ تھا۔ قدرت اللہ شہاب شہاب نامے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> مال وزر کی اس تکثیر و تقسیم میں مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں برابر کے شریک تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ بنگالی حضرات اپنا لائسنس زیادہ تر مغربی پاکستان میں فروخت کرنے کی کوشش کرتے تھے کیوں کہ یہاں پر خریدار نسبتاً زیادہ تھے اور قیمت بھی زیادہ ملتی تھی۔ بظاہر اس سے یہی گمان ہوتا تھا

کہ اس بندر بانٹ میں مغربی پاکستان کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا جارہا ہے، لیکن حقیقت میں ایسی کوئی بات نہ تھی۔[۵]

اعداد و شمار اس سلسلے میں اور طرح کے نتائج سامنے لاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان نے مرکز کو آمدنی کا کل ۲۴ فیصد اور مغربی پاکستان نے ۷۴ فیصد فراہم کیا اور مرکز اور صوبوں کو آمدن سے جو حصہ دیا گیا تھا اس میں مشرقی پاکستان کو ۳۶۷ کروڑ ۸ لاکھ روپے اور مغربی پاکستان کو ۳۹۰ کروڑ ۲ لاکھ روپے دیے گئے تھے یعنی پاکستان کی مجموعی آمدنی کا ۴۹ فیصد مشرقی پاکستان کو اور ۵۱ فیصد مغربی پاکستان کو دیا گیا تھا۔ اس بات کا دھیان رکھنا بہت ضروری تھا کہ مشرقی خطے کی آبادی مغرب کی نسبت زیادہ تھی چنانچہ ان کو سالانہ آمدنی کا زیادہ حصہ دیا جانا چاہیے تھا۔ تاہم دیگر تمام محرکات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک سنگین غلطی تھی جو مغربی حصے کے رہنماؤں سے سرزد ہوئی تھی۔

ملک کا دار لحکومت چونکہ کراچی تھا اور اس اعتبار سے وہ صنعتی و معاشی ترقی کا مرکز بھی بنتا جارہا تھا۔ کپڑے کی صنعت بھی مغربی پاکستان کا تخصیصی میدان تھی۔ رہی سہی کسر مشرقی خطے کی موسمی صورتحال نے پوری کر دی تھی جہاں آئے روز بارشوں اور سیلابوں نے کبھی اس خطے کی اقتصادی صورتحال کو مستحکم نہیں ہونے دیا تھا۔ ایسے میں ایبڈو کی زد میں آنے سے بہت سے رہنماؤں کو نااہل قرار دیا جاتا رہا اور سیاسی سرگرمیوں کی معطلی حالات کو مزید بگاڑ رہی تھی۔ مشرق و مغرب کو متحد رکھنے والے واحد رہنما سہروردی ۱۹۶۳ء میں وفات پاگئے اور یوں سہروردی کی وفات کے بعد پارٹی کی قیادت شیخ مجیب الرحمٰن کے کندھوں پر آن پڑی۔ وہ اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک تھے اور عوام کو قابو میں کرنے کے تمام گروں سے واقف تھے۔ ان کی تعلیم مشرقی علاقے کے ایسے ماحول میں ہوئی تھی جہاں ہندو اساتذہ نے بنگالی مسلمانوں کو قومیت کا درس دیا تھا۔ بنگالی قومیت پرستی کے حامی مجیب الرحمٰن ۴۰ سال کی عمر میں ہی سیاست کے میدان میں عملاً کود پڑے تھے۔ ان حالات میں جب سیاسی صورتحال کا اونٹ کسی کروٹ نہ بیٹھے تو ہنگاموں اور ہڑتالوں کا اثر بہت بری طرح ملکی معیشت کو متاثر کرتا ہے۔

مشرقی خطے میں صرف عوامی لیگ نہ تھی بلکہ فضل الحق کی کرشک سرامک پارٹی کے علاوہ بھی دو تین جماعتیں تھیں۔ مسلم لیگ نے وقت کے ساتھ ساتھ اپنا اعتماد کھونا شروع کر دیا تھا۔ زبان کے معاملے میں لاتعلقی نے مسلم لیگ کو مشرقی عوام کی نگاہ میں بالکل گرا دیا۔ ان حالات میں بہت سے معروف راہنماؤں نے اس پارٹی کو چھوڑنا شروع کر دیا جس سے اس پارٹی کی طاقت دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی گئی اور دیگر پارٹیاں اپنے قدم جمانے لگیں۔ مشرقی خطے کی عوام کے احساس محرومی کو ختم کرنے کے اقدامات نہ کیے گئے اور حالات اس حد تک ابتر ہو گئے کہ نومبر ۱۹۷۰ء میں مشرقی پاکستان میں آنے والا ہولناک سیلاب سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ اس سے قبل

بھی حاکموں کی بے حسی نے اس علاقے کو غربت کی لکیر تک پہنچا دیا تھا مگر اس دفعہ کے نقصان نے اس معاملے کو شدید صورتحال سے دوچار کر دیا۔ یوں یہ مسئلہ بین الاقوامی سطح پر اہمیت اختیار کر گیا۔

اقوام متحدہ کی طرف سے بھی خطیر رقم وہاں کی عوام کو امداد کی خاطر بھیجی جانے لگی مگر بھارت نے یہاں بھی اپنا ساز شی کردار ادا کرنا بہت ضروری سمجھا تھا۔ اس نے اقوام متحدہ کو بار بار یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ پاکستان وہ تمام پیسہ اور اشیاء اپنی افواج پر خرچ کر رہا ہے جو مشرقی حصے کی فلاح و بہبود کیلئے دی جا رہی ہیں۔ بقول شیر از دستی:

> مغربی اخبارات، بہ شمول قدر کی نگاہ سے دیکھے جانے والے ٹائمز آف لنڈن نے اس طرح کی تباہ کاریوں سے بچاؤ کے لیے امدادی کام اور اقدامات نہ کرنے کا الزام مغربی پاکستان کو دیا۔ [۷]

یہ سیلاب اس محبت کو بھی ہڑپ کر گیا تھا جو مشرقی حصے کے لوگوں کے دلوں میں مغربی حصے کے لیے تھی۔ بین الاقوامی طور پر مغربی پاکستان کو ایک جارحانہ خطے کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا تھا۔ ہندوؤں کا شائع کردہ لٹریچر بھی ساتھ ساتھ اپنا کام بخوبی کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس ثقافت کا بھی عمل دخل تھا جو بنگالیوں کو ہندوؤں کے زیادہ قریب کرتی تھی۔ رقص و موسیقی کا کلچر مغربی حصے میں معیوب سمجھا جاتا تھا جب کہ مشرقی حصے میں ایک اضافی خوبی کی صورت میں گردانا جاتا تھا۔

ان سب کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں جب مغربی پاکستان جنگ کا میدان بنا تو مشرقی پاکستان کے دفاع کی طرف توجہ نہ دی گئی۔ بھٹو نے جنگ کے بعد کہا کہ چین نے دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے مشرقی حصے کی حفاظت کی ہے تو بنگالیوں نے محسوس کیا کہ اگر ان کا دفاع چین یا بھارت سے ہی ہونا ہے تو ان کو پاکستان کے ساتھ جڑے رہنے میں کیا فائدہ ہے اور یوں علیحدگی کی ایک اور مضبوط وجہ ان کے ہاتھ میں آ گئی۔

سیاسی گٹھ جوڑ بھی کسی صورت رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مجیب الرحمٰن نے اپنا چھ نکاتی فارمولا پیش کر دیا تھا۔ چھ نکاتی فارمولے میں درج ذیل باتیں شامل تھیں:

۱۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات براہ راست ہونے چاہیں اور عالمی بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ہونے چاہیں۔

۲۔ مرکز محض دفاع اور امورِ خارجہ کا ذمہ دار ہو گا۔

۳۔ کرنسی علاقائی ریزرو بینکوں کے کنٹرول میں ہونی چاہیے۔

۴۔ وفاق بنانے والی اکائیاں مرکز کو پہلے سے طے شدہ طریقہ کار کے ذریعے رقم مہیا کریں گی۔

۵۔ وفاق تشکیل دینے والی اکائیاں اپنے علیحدہ فارن ایکسچینج اکاؤنٹس کھولیں گی۔

۶۔ وفاقی اکائیاں اپنی ملٹری اور پیرا ملٹری فورسز بنائیں گی۔

یہ نکات ملک کو دو خود مختار ریاستوں کی طرف لے جا رہے تھے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ میں مشرق کا دفاع نہ کیا جانا ان وجوہات کو مزید تقویت دے رہا تھا۔ مجیب دن بدن عوام میں مقبولیت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ وہ ایک سیاسی گٹھ جوڑ سے مکمل آگاہی رکھنے والا قومیت پرست بنگالی تھا۔ ۱۹۶۸ء میں اگر تلہ سازش کیس کا واقعہ ہوا جب مجیب الرحمٰن کو ان کے ساتھیوں سمیت گرفتار کیا گیا تھا جلد ہی حکومت نے اس سازش کو بے نقاب بھی کر دیا تھا۔ بھارت ان تمام معاملات میں مکمل راہنمائی اور مدد فراہم کر رہا تھا جو کسی بھی صورت دونوں خطوں کو علیحدہ کرنے میں سر گرم تھا۔ مگر اس کیس کے بعد مجیب ہیرو کے روپ میں عوام کے سامنے آیا۔ حالات پہلے ہی الٹی ڈگر پر چل رہے تھے جو سازشوں کے تانے بانوں کا نتیجہ تھے اور اب باقی کھلی آزادی کی تحریکوں نے پورا کرنا شروع کر دیا تھا۔ ایوب خان کی حکومت پر سے عوام کا اعتماد کمزور ہوتا جا رہا تھا۔ عسکری گٹھ جوڑ بھی مکمل عروج پر تھا اور حکومت کو جائز طریقے کی بجائے خاموشی سے اپنا بوریا بستر لپیٹنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

معاہدہ تاشقند پر دستخط کی صورت میں ذوالفقار علی بھٹو نے استعفٰی دے دیا تھا جس سے ملک میں ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ایوب حکومت مزید دلدل میں دھنستی چلی جا رہی تھی۔ ایوب خان نے گول میز کانفرنس کا انعقاد کیا جس میں شیخ مجیب الرحمٰن کی شرکت پر زور دیا جا رہا تھا۔ علیحدگی کی سازش پہلے ہی اپنی جڑیں بہت مضبوط کر چکی تھی۔ مجیب الرحمٰن نے اپنے چھ نکاتی ایجنڈے کو پیش کیا اور ملک کی سلامتی کی بجائے اپنی گفتگو کا لب لباب علیحدگی کی صورت میں پیش کیا۔ ایوب خان کو یہ تجویز قبول نہ تھی ایسے میں کانفرنس بغیر کسی حتمی فیصلے کے اختتام پذیر ہو گئی۔

دوسری طرف مرکز کی حکومت میں جو گٹھ جوڑ تھا اس میں سیاسی پارٹیاں تو ایک طرف، عسکری قیادت کا بہت عمل دخل تھا۔ یحییٰ خان نے اپنے جرنیل ساتھیوں کے ساتھ مل کر ایوب خان پر دباؤ ڈالا کہ وہ استعفٰی دے دیں اور بیمار ایوب خان اعتماد کھوئی حکومت کو ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو یحییٰ خان کے حوالے کر کے اس بدنامی سے بچ گئے جو تاریخ نے یحییٰ خان کے ماتھے پر ایک کلنک کی صورت میں سجائی تھی۔ یحییٰ خان نے ۱۹۶۲ء کا آئین منسوخ کر دیا اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا۔ عوام نے تصور کیا تھا کہ دس سالہ مارشل لاء حکومت سے انہیں نجات مل جائے گی مگر در حقیقت خونی راج اب شروع ہوا تھا۔ ون یونٹ توڑ دیا گیا تھا اور ملک میں لیگل فریم ورک آرڈر کو نافذ کیا گیا جس کے تحت آئین کی منسوخی کے بعد ملک کے نظام کو چلایا جانا تھا۔ بقول عنایت اللہ:

ایوب خان اقتدار یحییٰ خان کو سونپ کر اور ملک فوج کے حوالے کر کے الگ ہو گیا۔ یحییٰ خان سے کسی بھلے کی نہیں بلکہ ہر برائی کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ اس نے امریکہ کے ہاتھوں میں کھیلتے ہوئے ملک کو اس انداز سے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا کہ ون یونٹ توڑ کر صوبے بحال کر دیئے۔ [۷]

ایک آدمی ایک ووٹ کا اصول لاگو کر دیا گیا تھا اور ۱۹۷۰ء میں انتخابات کرائے گئے۔ مشرقی پاکستان میں آنے والے سیلاب نے ان انتخابات کا رخ بھی موڑا تھا۔ حکومت کی سستی اور نااہلی نے وہاں کی عوام کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ اب ان کی سلامتی علیحدگی میں ہے۔ مجیب الرحمٰن نے کھل کر اپنے خیالات و تصورات کا فائدہ اٹھایا۔ لوگوں کی سوچ کو وہ رخ دکھایا جو اشتعال انگیزی کی دوسری صورت تھی۔ ملک دشمن عناصر کو بھی ہماری صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا ایک اور موقع ہاتھ آ گیا تھا سے سب نے اپنی اپنی جگہ حالات کو مزید بگاڑ کی طرف دھکیلنے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ انتخابات چوں کہ مخلوط بنیادوں پر ہوئے تھے اس لیے ہندو اقلیت نے سیاسی، معاشی اور نفسیاتی ہر لحاظ سے عوامی لیگ کا ساتھ دیا اور نتائج بہت فیصلہ کن تھے۔ عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان میں ۱۶۷ میں سے ۱۶۴ نشستیں حاصل کیں اور مغربی پاکستان میں پی پی پی نے ۱۴۶ میں سے صرف ۸۳ نشستیں حاصل کیں۔

اب اصولاً اقتدار اکثریت حاصل کرنے والی پارٹی کو منتقل کر دیا جانا تھا۔ مگر بھوک اور ہوس کی قسم جس کا تعلق اقتدار سے ہے، حکمرانوں کو بہت ستانے لگی۔ یحییٰ خان کے بیانات ملک میں اشتعال کو بڑھاوا دے رہے تھے ان کے مطابق اگر آئین تیار نہ ہو سکا تو انتخابات دوبارہ ہوں گے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے سب کو اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے سے روک دیا تھا اور شیخ مجیب الرحمٰن صرف چھ نکاتی فارمولا پر ہی اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے کے خواہاں تھے۔ مجیب الرحمٰن نے سیاسی چال چلنی شروع کر دی تھی جس سے ملک میں سول نافرمانی اور عدم تعاون کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ بھٹو اور مجیب کسی صورت بھی کوئی سیاسی حل تلاش کرنے کی طرف مائل نہیں ہو رہے تھے۔ مجیب کا کردار مشرقی پاکستان میں بہت مضبوط تھا کیوں کہ ان کی پارٹی نے پورے مشرقی خطے سے کامیابی حاصل کی تھی جبکہ بھٹو کے لیے یہ لمحہ فکریہ تھا۔ ان کے مقابلے میں مزید پارٹیاں بھی تھیں اور بھٹو کسی صورت بھی حزب اختلاف میں نہیں بیٹھنا چاہتے تھے۔ یحییٰ خان نے متعدد بار مجیب الرحمٰن اور بھٹو کو اسمبلی کے اجلاس پر آنے کیلئے متفق کرنا چاہا مگر دونوں لیڈروں کی انا وہیں قائم تھی کہ مغرب والا مشرقی اور مشرق والا مغرب میں آنے کو تیار نہ تھا۔ افتتاحی اجلاس کی تاریخ مجیب کی طرف سے ۱۵ فروری ۱۹۷۱ء اور بھٹو ۲۳ مارچ کے حق میں تھے۔ ۱۰ فروری ۱۹۷۱ء کے ڈان اخبار میں لکھا تھا:

عوامی لیگ کی طرف سے فوری طور پر قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کے لیے دباؤ ہر روز بڑھ رہا تھا۔ مجیب

الرحمٰن نے اس بیان کا کئی بار اعادہ کیا کہ بنگالی خون بہانا سیکھ چکے ہیں۔ [8]

مارچ ۱۹۷۱ء کو اسمبلی کے اجلاس کے ملتوی ہونے کا اعلان کوئی بھی نئی تاریخ بتائے بغیر کر دیا گیا تھا۔ یکم مارچ کو ڈھاکہ میں ہڑتال ہو گئی اور ۳ مارچ کو پورے صوبے میں ہڑتال ہو گئی۔ اسمبلی کے اجلاس میں التواء کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں فسادات کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لوٹ مار اور جلاؤ گھیراؤ میں متعدد غیر بنگالی اور مغربی پاکستان کے خاندانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا تھا۔ حالات بہت ابتر ہو چکے تھے۔ پولیس اہلکاروں سمیت کئی لوگ لقمہ اجل بن گئے تھے۔ ملک میں انسانیت کا جنازہ نکل چکا تھا، اخبارات پر سنسر شپ عائد کر دی گئی تھی۔ حالات قابو سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔ ان حالات کے پیش نظر مجیب الرحمٰن نے حکومت کے سامنے درج ذیل چار مطالبات رکھ دیے۔

۱۔ مارشل لاء اٹھایا جائے۔

۲۔ اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کیا جائے۔

۳۔ فوج کو بیرکوں میں واپس بھیج دیا جائے۔

۴۔ حالیہ کشت وخون کی تحقیقات کرائی جائیں۔

مشرقی پاکستان کی اعلیٰ عسکری قیادت نے مغربی پاکستان جا کر حکومت کو آگاہ کیا کہ اگر اس مسئلے کا سیاسی حل نہ تجویز کیا گیا تو مشرقی حصہ تاریخ کے اوراق میں مغربی خطے سے الگ موجود ہو گا اور ملک کا جغرافیہ بدل جائے گا۔ ۷ مارچ ۱۹۷۱ء کو جنرل ٹکا خان گورنر اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا کر مشرقی پاکستان بھیجے گئے۔ مگر وہاں ان کا حلف لینے سے انکار کر دیا گیا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ مجیب الرحمٰن کا اثر ورسوخ تمام اداروں پر قائم ہو چکا ہے۔ یحییٰ خان نے اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن سے ملنے کا فیصلہ کیا انہیں حالات کی سنگینی کا احساس ہو چکا تھا۔ یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کے اجلاس کی نئی تاریخ ۲۵ مارچ کا اعلان کر دیا تھا۔ اجلاس کی تاریخ میں پس وپیش بنگالی عوام اور سیاسی راہنماؤں کو بھڑکانے کی لیے کافی تھی۔ بقول شیر از دستی:

> پور بانی ہوٹل میں ایک فوری پریس کانفرنس بلائی گئی۔ مجیب غضب ناک تھے وہ دیوانہ وار بولنے لگے "اگر سازشیوں کو ہوش نہ آیا تو آپ تاریخ بنتی دیکھیں گے۔ یہ ہر بنگالی کا فرض ہے۔۔۔۔۔ کہ ان لوگوں کے ساتھ تعاون نہ کرے جو اقتدار کی سپردگی کے خلاف ہیں۔ بلکہ بنگلہ دیش کے خلاف سازش کو اکھاڑ پھینکنے کے لیے ہر وہ کام کرے جو اس کے بس میں ہو۔ [9]

یہ وہ پہلا موقع تھا جب مجیب نے مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش کے نام سے پکارا تھا۔ مجیب الرحمٰن کی ہنگامی اور

آتشی مواد سے لبریز تقریروں نے وہ فسادات کھڑے کیے کہ ایک ہی ملک میں رہنے والے مسلمان بھائی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ سیاسی اشتعال انگیزی کا مقصد ہی یہ تھا کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے ان فسادات کو روکنے کیلئے کوئی بھی حکمت عملی اختیار کریں گے تو اُن پر اُلٹا الزام عائد کر دیا جائے گا۔

دوسری طرف سنسر شپ کی وجہ سے ایسی خبروں کی تشہیر پر پابندی عائد کر دی گئی تھی جو کسی بھی طرح سے مغربی پاکستان کی عوام کو بھی اشتعال دلانے کا باعث بن سکتی ہوں۔ اخبارات و جرائد حتی الامکان اس کوشش میں تھے کہ اس قسم کی خبریں نہ پھیلائی جائیں۔ مگر حکومت کا یہ قدم ان کے اپنے حق میں نقصان دہ ثابت ہونے والا تھا۔ ایک مخصوص وقت کے بعد جب یہ تمام حالات لوگوں کے سامنے آئے تو اُس میں فوج کا کردار بہت مشکوک ہو چکا تھا۔

اگست ۱۹۷۱ء میں چھپنے والے وائٹ پیپر نے مشرقی پاکستان میں ہونے والے فسادات کو کھل کر بیان کیا۔ حکومت اس قدر شدید رد عمل کیلئے تیار نہیں تھی مگر مشرقی پاکستان کی عوام جو ایک عرصے سے محرومی کا شکار تھی مغرب سے کیے جانے والا ہر عمل ان کی نظروں میں شک کا بیج اور مضبوط کر دیتا تھا۔ عنایت اللہ اس سلسلے میں کہتے ہیں:

> اخباروں میں اس قسم کی شہ سرخیاں چھپنے لگیں "غیر ملکی ظالم فوجیو یہاں سے نکل جاؤ"۔ اخباروں میں کھلے الفاظ میں "بنگلہ دیش فوج" کی ترتیب اور تنظیم شائع ہونے لگی۔ اغوا، آبرو ریزی اور قتل و غارت اور زیادہ بڑھ گئی۔ [۱۰]

مارچ کے مہینے میں صدر یحییٰ نے مشرقی پاکستان کا دورہ کیا تو ہوائی اڈے پر ان کے استقبال کیلئے کوئی موجود نہ تھا۔ بنگالی ہر عمل سے اس بات کی یقین دہانی کرانا چاہتے تھے کہ وہ خود پر کی گئی زیادتیوں کا بدلہ لینے کیلئے تیار ہیں۔ صدر کے پہنچتے ہی دونوں طرف کی عسکری قیادت اور دیگر لوگ ایک سیاسی حل کی تلاش کیلئے ٹیمیں تشکیل دینے لگ گئے تھے۔ مشرقی پاکستان پہنچنے کے بعد صدر یحییٰ اور مجیب کے درمیان ہونے والی پہلی باقاعدہ ملاقات میں مجیب نے ان چار نکات کا تذکرہ چھیڑا تو صدر نے کہا کہ فوج کو بیرکوں میں واپس بھیجنے کا حکم دے دیا گیا ہے اور انکوائری کا حکم بھی دے دیا گیا ہے۔ دوسرے دو نکات، اقتدار کی منتقلی اور مارشل لاء کا خاتمہ قومی اسمبلی کا کام ہے۔ صدر یحییٰ اور مجیب الرحمٰن کی ملاقات کا اختتام اس بات پر ہوا کہ دونوں مذاکراتی ٹیمیں ملیں گی اور اس میں بھٹو شامل نہیں ہوں گے۔

۱۷ مارچ کو مذاکراتی ٹیمیں ملیں اور تجاویز پر غور کیا۔ ۱۹ مارچ کو ٹیمیں دوبارہ ملیں۔ اس معاملے کو ایک سیاسی اور پر امن حل کی طرف لے جایا جارہا تھا۔ تمام مغربی پاکستان کے راہنما ماسوائے بھٹو کے سب ڈھاکہ پہنچ گئے تھے۔ عوامی لیگ نے تمام مطالبات کو ایک نسخے کی صورت میں پیش کر دیا تھا۔ وہ لوگ اقتدار کی جلد از جلد منتقلی چاہتے تھے۔ بیس اور اکیس مارچ کی درمیانی رات تک اقتدار کی منتقلی سے متعلق ایک خوشگوار احساس پیدا ہو چکا تھا مگر مجیب الرحمٰن نے اچانک وفاقی کابینہ کی تشکیل کا نکتہ اعلان نامے سے نکالنے کی تجویز دے دی۔ اب یحییٰ خان کو محسوس ہوا کہ ایک پر امن سیاسی صورتحال میں سب سے بڑی حائل رکاوٹ مجیب الرحمٰن ہے۔ صدر نے وقفے وقفے سے پی پی پی کے صدر کو پیغام بھجوایا کہ وہ ڈھاکہ پہنچیں اور اس مسئلے کا کوئی پر امن حل نکالیں مگر انہوں نے ہر دفعہ یہ پیش کش نہایت خوش اسلوبی سے ٹھکرا دی۔

اس بات کا یقین کر لینے کے بعد کہ مجیب ان سے ملنے کیلئے راضی ہیں بھٹو ۲۲ مارچ کو ڈھاکہ آئے۔ مجیب الرحمٰن اور بھٹو کی ملاقات کا کوئی خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا۔ حالات کسی کروٹ نہیں بیٹھ رہے تھے۔ ۲۳ مارچ کو حالات کا دھارا اس انداز میں بہنے لگا کہ بنگلہ دیش کا پرچم اسی قائد کے ہاتھوں لہرا دیا گیا جس کی کوششوں سے سلہٹ کا علاقہ پاکستان میں شامل ہوا تھا۔ یعنی مولانا بھاشانی نے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کا عندیہ دے دیا۔ رات کے اندھیرے میں صدر آغا محمد یحییٰ خان، کراچی کے لیے روانہ ہو گئے یہ ایک غیر رسمی طریقہ تھا۔ مسائل کا حل ملٹری ایکشن کی صورت میں آن موجود تھا۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور عوامی لیگ کو غیر قانونی جماعت قرار دے دیا گیا تھا۔ بھٹو کا کردار ابتداء سے لے کر علیحدگی تک ایک معما بنا رہا۔ تاریخ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ یحییٰ اور مجیب کے مذاکرات اچانک اتنے سنگین نتائج کی صورت میں کیوں سامنے آئے تھے۔ وقت نے ایسا پانسہ پلٹا کہ ملٹری ایکشن کی صورت میں مشرقی پاکستان کا خطہ فسادات کا گڑھ بن گیا۔ حکومت نے پر امن راستہ اختیار کرنے کی بجائے غلط فیصلہ کر کے کاروائی کا آغاز کر دیا۔

بھارت جس کا کردار تقسیم ہند سے قبل بھی سازشی تھا اب پاکستان کے ٹوٹنے میں بھی اسی طرح برقرار رہا تھا۔ ہندوستانی اساتذہ نے جو کھیپ تیار کی تھی وہ اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے جا رہی تھی۔ آپریشن سرچ لائٹ کے شروع ہوتے ہی بنگالی بہت بڑی تعداد میں نقل مکانی کر کے ہندوستان پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ ہندوستان نے عالمی برادری کو یہ تاثر دیا کہ یہ آبادی کروڑوں کے حساب سے ہمارے خطے میں نقل مکانی کر کے آرہی ہے۔ ایک مغربی محقق اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

ہندوستان کے یہ دعوے کہ لاکھوں بنگالی پناہ گزینوں کو وہاں بھیج کر مشرقی پاکستان میں اسے زبردستی ملوث کیا گیا تھا، اس حقیقت کے برعکس ہیں کہ ہندوستانی اعلیٰ کمان نے اپنی فوجیں مشرقی پاکستان کی سرحد کے قریب کرنے پر اس وقت توجہ مرکوز کر دی تھی جب فروری ۱۹۷۱ میں ابھی کوئی مشرقی بنگالی پناہ گزین ہندوستان داخل نہیں ہوا تھا۔ [۱۱]

بھارت نے پناہ گزینوں کے لیے بے شمار امداد موصول کی جو صرف مادی اشیاء تک محدود نہ تھی بلکہ اس میں ہمدردیاں بھی شامل تھیں۔ در حقیقت نقل مکانی کرنے والوں میں آدھے سے زیادہ آبادی ان ہندوؤں کی تھی جو تقسیم برصغیر کے وقت اسی خطے میں رہ گئے تھے اور انہیں کسی نہ کسی صورت واپس ہی جانا تھا۔ حکومت نے وقتی طور پر آپریشن کر کے حالات پر قابو پا لیا تھا مگر یہ کوئی مستقل حل نہیں تھا۔ اصل مقصد وہاں کی عوام کے دلوں میں محبت اور عزت قائم کرنا تھا۔ پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھتے ہوئے فوج اور حکومت پر مشرقی عوام کا اعتماد بحال کرنا تھا۔ فوج اپریل کے آخر تک بڑے بڑے شہروں میں بہت حد تک بغاوت پر قابو پا چکی تھی باغیوں کو نکال دیا گیا تھا۔ مئی تک تمام اہم علاقوں تک فوج کی رسائی ہو گئی تھی۔ یہ سب طاقت کے بل بوتے پر ہوا تھا اور اس میں دِلوں کو جیتنے والا کوئی عمل شامل نہیں تھا۔

بھارت جو پاکستان کا کئی سال پرانا رقیب ہے اور جس نے ہمیشہ وقت اور موقع کا انتظار کیا ہے کہ وہ پاکستان کو پچھاڑ سکے اِس موقع پر کیسے خاموش بیٹھ سکتا تھا۔ سیاسی و نفسیاتی طور پر وہ بہت پہلے اپنی جنگ کا آغاز کر چکا تھا مگر اس کی وہ صورت جس کا اظہار عسکری قوت تھی اس کا موقع بھی جلد اس کو فراہم کر دیا گیا تھا۔ بھارت اس وقت سے پاکستان کے خلاف جنگ کرنے کی منصوبہ بندی کر چکا تھا جب ابھی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ یہ دفاعی معائدہ کوئی عام معائدہ نہیں تھا اس کے پس پردہ بہت سے عناصر کار فرما تھے۔ اسی سال اکتوبر میں اندرا گاندھی نے یورپی ممالک کا دورہ کیا تا کہ ان تمام راستوں کو صاف کر سکے جو پاکستان کو دولخت ہونے سے بچا سکتے تھے۔ موراجی دیسائی اندرا کے بارے میں کہتے ہیں کہ:

معاہدہ پر دستخط کرنے کے بعد وہ شیطان کے ساتھ بھی اتحاد کریں گی اگر انہیں لگا کہ یوں ان کا نصب العین پورا ہو جائے گا۔ [۱۲]

بھارتی حکام و افواج کی جانب سے تمام تیاریاں مکمل تھیں اس فوج میں صرف ماہر بھارتی کمانڈوز، سپاہی اور دیگر فوجی ہی نہ تھے بلکہ مکتی بانی کا بھی بہت بڑا کردار تھا۔ مکتی بانی دراصل وہ بنگالی لوگ تھے جن کو بغاوت پر اکسا کر پاکستان کے خلاف فوجی ایکشن میں استعمال کیا جانا تھا ان میں سے بھی بہت خود بھارتی فوجی تھے جن کا مقصد بنگالیوں

کا نام لے کر فوج کا مورال کمزور کرنا تھا کیوں کہ جنگ دشمن سے تو جیتی جا سکتی ہے مگر اپنے ہی لوگوں کے لیے ہتھیار اٹھانا آپ کو نفسیاتی و عملی دونوں طرح سے کمزور کر دیتا ہے۔ پاکستانی افواج کے لیے یہ سب سے بڑا مسئلہ تھا کہ ان کی جنگ اپنے ہی ملک میں تھی جہاں غیروں کے ساتھ اُن کے اپنے بھی گھناؤنی سازش کا شکار ہو رہے تھے۔ ایسے میں دوسری طرف کے حکمرانوں کا عمل قابل دید تھا۔ انہیں اس طوفان کی خبر ہی نہ تھی جو عسکری قوت کے ساتھ ساتھ ان کے بہت سے مسلمان ہم وطنوں کو بھی نگلتا جا رہا تھا۔ بے خبر اور عیاش حکمران اس کرب کو محسوس کرنے سے قاصر تھے۔ کرسی کی بھوک، اقتدار کی ہوس، رحم اور عقل مندی جیسی صفات عالی کو بڑی آسانی سے ہضم کر گئی تھی۔

۲۲ نومبر ۱۹۷۱ء کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر حملہ کر دیا تھا۔ اس بات کا اندازہ کیے بغیر کہ پاکستان کے مشرقی خطے میں افواج کس حد تک تھیں یا اسلحے کی صورتحال کیا تھی جنگی ایکشن شروع کر دیا گیا تھا۔ اب جب بھارت نے جنگ کا آغاز کر دیا تھا تو صورتحال پہلے سے بھی زیادہ ابتر تھی۔ بنگلہ دیش کا موسم مون سون کی بارشوں کی وجہ سے جنگی حالات کے لیے سازگار نہیں رہا تھا اوپر سے افواج، اسلحے، ایمونیشن کی کمی نے کسر پوری کر دی تھی۔ افواج پاکستان کو بھارت کے ساتھ ساتھ اندرونی مزاحمت کا بھی سامنا تھا جو در حقیقت ایک نفسیاتی جنگ تھی۔ جنرل نیازی نے ۱۱ اپریل ۱۹۷۱ء کو ایسٹرن کمانڈر کی حیثیت سے جب چارج سنبھالا تھا تو حالات کا رخ کچھ مختلف تھا۔ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مغربی محاذ پر بھی لڑائی شروع ہو گئی تھی۔ جنگی حکمت عملیوں کو دیکھتے ہوئے مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے ہونا تھا۔ مگر مغربی پاکستان پر جنگی محاذ بہت دیر سے کھلا تب تک مشرقی خطے میں حالات بہت ابتر ہو چکے تھے۔ مشرقی خطے میں بہت انسانیت سوز مظالم دیکھنے کو ملے۔ تاریخ نے ان تمام لمحوں کو ایسے انسانوں کی زبانی محفوظ رکھا ہوا ہے جن کی آنکھوں نے وہ دل دہلا دینے والے مناظر دیکھے تھے۔ بچوں کی لٹکتی لاشیں درختوں کے ساتھ رہ گئی تھیں۔ ان گنت عورتوں کی عزت پامال کی گئی اور ان کی بے حرمتی کی گئی تھی۔ نوجوانوں کو بہت بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ بنگالیوں اور ہندوؤں نے مغربی پاکستانیوں اور غیر بنگالیوں سے بہت ناروا سلوک رکھا تھا۔ قطب الدین عزیز نے اپنی کتاب (*Blood and Tears*) جس کا اردو ترجمہ سلیم منصور خالد اور ظہور احمد قریشی نے خون اور آنسوؤں کا دریا کے نام سے کیا ہے میں کہتے ہیں:

> بے شمار غیر بنگالی مسافروں، جن میں مرد، عورتیں اور بچے شامل تھے، بنگالی مسلح دہشت گردوں نے ریل کے ڈبوں سے چن چن کر باہر نکالا، انہیں لوٹا اور اس کے بعد ان کی بڑی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ان مقتولین کی لاشیں ریل کی پٹڑی پر پھینک دی گئیں۔ [۱۳]

پاکستانی افواج کی تعداد بھارتی افواج کے مقابلے میں بہت کم تھی۔ بحری، بری اور ہوائی ہر لحاظ سے اسلحے اور افرادی قوت میں بہت فرق تھا۔ نفسیاتی حالت بھی اس سب پر بہت حد تک اثر انداز ہوئی۔ جنگ میں پاکستانی افواج نے اپنی ہمت سے کہیں بڑھ کر لڑائی لڑی مگر حکمران اس بات سے ناواقف تھے کہ ان کی چالوں نے عسکری قوت کو کس دھانے پر لا کھڑا کیا ہے۔ مسلح افوج سے لے کر فضائی قوت تک کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر سکی تھی اس کی دیگر وجوہات کے ساتھ ساتھ انتظامی امور کی درست منصوبہ بندی نہ ہونا بھی تھا۔ مغربی سرحد کا بہت سا علاقہ لڑے اور کچھ لڑے بغیر ہندوستان کے پاس چلا گیا تھا۔ یہاں بھی فوج کی تعداد کو مد نظر رکھے بغیر حملہ کیا گیا تھا اور جنگی منصوبہ بندی بھی درست نہ تھی۔

مشرقی پاکستان میں بھی ہندوستانی فوج نے پاکستانی فوج کے گرد گھیرا تنگ کر دیا تھا۔ مناسب ہتھیاروں کا نہ ہونا، جدید اسلحہ جات کی فراہمی نہ ہو سکنا، کمک کا نہ پہنچنا اور دیگر عوامل نے مل کر فوج کو بے بس کر دیا تھا۔ گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگ گئی تھی۔ پاکستان بنانے میں جن لوگوں نے اپنا خون پسینہ ایک کیا تھا آج وہی لوگ ہندو فوج کے استقبال کے لیے حاضر تھے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء تاریخ پاکستان کا وہ سیاہ دن تھا جب پاکستانی کا اٹوٹ انگ اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گیا تھا۔ پاکستانی فوج کے ۹۰۰۰۰ (۹۰ ہزار) سپاہیوں نے جنرل نیازی کی قیادت میں ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ اس کے لیے باقاعدہ ڈھاکہ رمنا ریس کورس گراؤنڈ میں ہتھیار ڈالنے کی تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہندوستانی جنرل جگجیت سنگھ اروڑہ کے سامنے جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کیے۔ قومی ہی نہیں عالمی سطح پر بھی یہ دن مسلمانوں کیلئے انتہائی شرمندگی کا دن تھا۔ اس سے زیادہ رسوائی کیا ہو سکتی تھی کہ اپنے ہی ملک کی حفاظت کیلئے جنگ کرنے والی ملکی آبادی کا ۵۴ فیصد حصہ گنوا چکے تھے۔ قومی ندامت کا یہ دن تاریخ میں سیاہ حروف سے رقم کر دیا گیا۔ پاکستان میں اقتدار بھٹو کو منتقل کر دیا گیا تھا۔

۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ذوالفقار علی بھٹو نے بطور صدر پاکستان اور پہلے سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا حلف اُٹھایا۔ ۲۶ دسمبر کو انہوں نے سقوط ڈھاکہ کے اسباب، عوامل اور ذمہ داری کے تعین کے حوالے سے ایک کمیشن مقرر کیا جس کی سربراہی چیف جسٹس حمود الرحمٰن کر رہے تھے اس لیے اسے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا نام دیا گیا۔ جس نے اپنی پہلی رپورٹ ۱۹۷۲ء میں پیش کر دی تھی۔ مگر اصل حقائق کیا تھے اور بھٹو نے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے اصل حقائق کو کس حد تک چھپایا اس راز سے پردہ نہ اُٹھ سکا۔ ۱۹۷۴ء

میں یہ رپورٹ حتمی صورت میں صدر کو پیش کر دی گئی تھی۔ حمو د الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے ایک باب میں درج ہے:

> حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ اور اس کی تحقیقات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ کس قسم کے لوگ ہمارے حکمران رہے، انہوں نے اپنے ملک کے لوگوں کو بے دردی سے قتل کے گھاٹ اتارا، ملک توڑا، اور اپنے حریف ملک ہندوستان کے فوجی جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے لیکن اقتدار اپنے ملک کے الیکشن جیتے ہوئے لوگوں کے سپرد نہ کیا۔ [۱۴]

بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کو براستہ لندن ڈھاکہ روانہ کر دیا تھا۔ جنوری ۱۹۷۲ء میں شیخ مجیب نے بنگلہ دیش کے وزیر اعظم کا حلف اُٹھایا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے نتیجے میں پاکستان کے ۹۰۰۰۰ (۹۰ ہزار) سپاہی بھارت کے پاس قید تھے جن کی رہائی ابھی تک ممکن نہیں ہوئی تھی۔ بعد میں کئی بار مذاکرات ہوئے اور جنگی قیدیوں کی مرحلہ وار واپسی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بھارت اور پاکستان کے مابین سربراہی مذاکرات شملہ کے مقام پر ۱۹۷۲ء میں ہوئے جس کے نتیجے میں شملہ معائدہ طے پایا اور بھارت نے پاکستان کے مقبوضہ علاقے واپس کر دیے۔ سقوطِ ڈھاکہ ہماری تاریخ میں سقوط بغداد اور سقوط ہسپانیہ سے کہیں زیادہ بڑا اور الم ناک سانحہ ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے اسباب اور عوامل کا درست کھوج لگائیں تو شاید ہم اس سوال کا مناسب جواب تلاش کر سکیں کہ آیا وہ کون سی وجوہات تھیں کہ ملکی تاریخ نے ۹۰۰۰۰ (۹۰ ہزار) سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ پاکستان کی ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی تاریخ کا ایسا سانحہ تھا جسے ہم چاہ کر بھی تاریخ کے اوراق میں سے مٹا نہیں سکتے ہیں۔ ایسا نہیں کہ ملکوں کی جغرافیائی سرحدیں کبھی تبدیل نہیں ہوئیں مگر اتنی بڑی تبدیلی کہ جہاں ملک کی اکثریتی آبادی نے اقلیت سے نجات حاصل کی تھی ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ عوامل سیاسی ہوں، نفسیاتی یا عسکری تاریخ کا رخ نہیں موڑا جا سکتا ہے۔ اس بات کا معقول اور منطقی حل تلاش کیا جانا بہت ضروری ہے کہ آیا ایسی کیا وجوہات تھیں کہ ہمیں سقوطِ ڈھاکہ کا دن دیکھنا پڑا اور ملک کو عالمی سطح پر شرمندگی کا طوق گلے میں لٹکانا پڑا تھا۔ یہ ایسی رُسوائی تھی جس میں اپنوں اور غیروں نے مل کر ہمیں سربازار برہنہ کر دیا تھا۔ افسوس کی بات تو یہ بھی ہے کہ ہمارا غیر احتسابی رویہ ہمیشہ سے حقائق کو چھپاتا آیا ہے ہم نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی جس سے ان اصل حقائق کو سامنے لایا جاتا اور قوم کو اس عظیم اور الم ناک سانحے کی وجوہات سے آگاہ کیا جاتا۔

سقوطِ ڈھاکہ کے لیے ہم کسی ایک شخص کو موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر کی گئی سازش کو جس طرح سے ہمسایہ ملک اور خود اپنے لوگوں نے پایۂ تکمیل تک پہنچایا تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔

پاکستانی قیادت کی نااہلیوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور ملک کی اکثریتی آبادی کو الگ کر ڈالا۔ عوامل کا جائزہ لیں تو تقسیم ہند سے ہی بھارت نے ہمیشہ اپنا مکمل اور فعال کردار ادا کیا تھا۔ چاہے وہ اثاثوں کی غیر منصفانہ تقسیم ہو یا ریاستی سازشیں۔ تقسیم کے بعد ہندو اساتذہ کی ایک بڑی تعداد مشرقی پاکستان میں ہی رہ گئی تھی اور بنگالی عوام میں نسل و قوم پرستی کو پروان چڑھانے میں تن دہی سے کام کرنے لگ گئی تھی۔ تہذیبی و ثقافتی اقدار میں بھی بنگالی مسلمان ہندوؤں کی تہذیب سے بہت حد تک مماثلت رکھتے تھے۔ اس لیے ان کا تہذیبی جھکاؤ بھی ہندوؤں کی طرف زیادہ تھا۔ تہذیب کا رنگ اس قدر مضبوط ثابت ہونے لگا کہ مذہب کا رنگ پھیکا پڑتا چلا گیا اور اسلام کے نام پر بننے والا ملک تقسیم کی ڈگر پر چل نکلا۔ بقول عنایت اللہ:

> تعلیمی اداروں کی طرف بھی کسی نے توجہ نہ دی۔ نصابی کتابیں کلکتہ سے بھی چھپ کر آتی رہیں۔ اردو کے ایک قاعدے میں اس قسم کے فقرے شامل تھے۔۔۔" رام اچھا لڑکا ہے رحیم برا لڑکا ہے"۔۔۔ اور اس طرح بظاہر بے ضرر اور محسوس نہ ہونے والے طریقوں سے مسلمان بچوں کی برین واشنگ ہوتی رہی۔ [۱۵]

نظریہ پاکستان کی روح ختم ہونے لگ گئی۔ اس پر ہندوانہ لٹریچر بھی اپنا مکمل اثر دکھانے لگ گیا۔ ہندو اساتذہ و پروفیسرز نے تقسیم کے وقت سے جس نسل میں قومیت پرستی ڈالی تھی اس کو اب استعمال کرنے کا وقت آن پہنچا تھا۔ یہ ہی وہ نسل تھی جو "جے بنگلہ" کے نعرے لگاتی اور پاکستان کے خلاف زہر اگلتی تھی۔ ۱۹۵۳ء تک وہ نسل مکمل طور پر عملی بغاوت کیلئے تیار ہو چکی تھی اور مغربی پاکستان سے اتنے سالوں میں ایک اسلامی اصولوں کا حامل نصاب تک نہ تیار ہو سکا۔ ایسے میں تعلیمی پالیسیوں کا نفاذ تو دور کی بات تھی ان راہنماؤں کے نزدیک کرسی کی جنگ اس سے کہیں زیادہ اہم تھی۔

عسکری ناکامی کی طرف نگاہ دوڑائیں تو اس کی بھی کئی وجوہات تھیں صاحب اقتدار طبقے میں ارباب اختیار، صدر یحیٰی خان جو ایوب خان سے اقتدار منتقل کروا کر صدارت میں آئے تھے، کثرت سے شراب نوشی کرنے کے عادی تھے۔ صدر یحیٰی کی قوت فیصلہ کی کمی، غیر سنجیدہ سیاسی روش، عیش پرستی اور عوام کو دھوکے میں رکھنے جیسی عادات نے ملکی سلامتی کو داؤ پر لگانے میں کوئی کثر اٹھا نہ رکھی۔ ان کی سربراہی میں اکثر فوجی جرنیل بھی اسی قسم کی عادات کے حامل تھے۔

مشرقی پاکستان کے کمانڈر جنرل امیر عبداللہ خان نیازی ۱۹۷۱ء کی جنگ کے وقت مشرقی پاکستان میں اپنے فرائض ادا کر رہے تھے۔ انہیں ایک ایسے علاقے میں جنگ لڑنے کا کہا گیا تھا جہاں ان کا سامنا اپنے ہی لوگوں سے تھا۔

جن کی حمایت مکمل بھارت کے ساتھ تھی اور اس کے حوصلے بڑھاتی تھی۔ جنگ کے لیے نہ ہی کوئی مکمل منصوبہ بندی اور حکمت عملی اپنائی گئی تھی اور نہ ہی افواج و اسلحہ مناسب تھا۔ تھوڑی سی فوج کو پورے علاقے میں پھیلایا گیا تو وہ کسی بھی جگہ کا مکمل دفاع نہیں کر سکتی تھی حالانکہ اس کے لیے مکمل منصوبہ بندی درکار تھی مگر جی ایچ کیو کا کوئی مناسب اور فعال کردار نہ نظر آیا۔ س سلسلے میں شیراز دستی کہتے ہیں:

> ایسا لگتا ہے کہ جی۔ ایچ کیو کا مشرقی پاکستان کی جنگ پر کوئی کنٹرول نہیں رہا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ انہوں نے جنگ کے آغاز کے دن ہی اسے بھلا دیا دیا تھا یا پھر وہ مکمل طور پر دوست ممالک کی افواج پر بھروسہ کر رہے تھے جو جاری پاک بھارت جنگ میں ان کی خاطر آکر مداخلت کرتیں۔[16]

سات آٹھ ماہ سے لڑنے والے فوجی تھک چکے تھے کیوں کہ اپنوں کے خلاف اس جنگ میں ان کی نفسیاتی شکست بھی ہونے جارہی تھی افواج پاکستان نے بہت ہمت سے دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا مگر ناقص منصوبہ بندی، اسلحہ کی کمی، حکمرانوں کی بے حسی اور مخالف سمت سے کی گئی جارحانہ کاروائی نے ہمیں وہ دن دکھایا جو کسی بھی قوم کیلئے ذلت و رسوائی کا گڑھا ہوتا ہے۔ حکمرانوں کا انداز ایسا تھا جیسے یہ ایک سوچی سمجھی جنگ تھی اور جس میں شکست کا ہونا یقینی بات تھی۔ افواج پاکستان کو بھی جنگ جیتنے کے لیے اندرونی و بیرونی قوت درکار تھی۔ جس کا نہ ملنا ہتھیار ڈالنے کی ایک بڑی وجہ تھی۔ پولیس ایکشن کی طرح لڑی گئی یہ جنگ ایک حماقت سے شروع ہوئی اور ندامت پر ختم ہوئی۔

پاکستان کے معاملے میں عالمی طاقتوں کا کردار بھی فعال رہا ہے۔ روس سے پاکستان اور امریکہ کے دوستانہ تعلقات کبھی ہضم نہ ہو سکے تھے۔ صدر یحیٰی کے دور میں پاکستان نے امریکہ اور چین کے دوستانہ روابط کو بڑھانے کے لیے امریکی وزیر خارجہ ہنری کسنجر کو خفیہ طریقے سے اسلام آباد سے چین روانہ کر دیا جس کے نتیجے میں روس نے بھارت سے ایک بڑا دفاعی معائدہ کیا کیوں کہ پاک امریکہ دوستانہ تعلقات روس کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ مگر امریکہ نے کبھی بھی مشکل میں پاکستان کا ساتھ نہ دیا اور ۱۹۷۱ء میں اس کا ساتواں بحری بیڑہ بھی ایک فریب نکلا۔ بقول جیک اینڈرسن:

> یہ چال امریکہ نے درحقیقت ہندوستان کو خبردار کرنے کے لیے چلی تھی کہ واشنگٹن فوجی انداز میں مداخلت کر سکتا ہے اگر علاقے میں اس کے مفادات کو خطرات لاحق ہوئے۔[17]

چین کے پاکستان کے ساتھ ہمیشہ سے بہت دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ پاکستانی حکمرانوں کو یقین تھا کہ وہ چاہے کچھ نہ کریں مگر دوست اور ہمسایہ ملک چین ان کی مدد کرے گا۔ مگر اس دفعہ یہ بھی ان کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ جب ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں بھیجا گیا وفد چین پہنچا اور مدد کی درخواست کی تو چینی حکام نے ان کو ساٹھ

چین نواز کمیونسٹ بنگالیوں کی وہ فہرست دکھائی، بقول چینی حکام کے جن کی ہلاکت کی ذمہ دار پاکستانی فوج تھی یوں امداد کا راستہ بھی ختم ہو گیا۔ عالمی سطح پر ویسے بھی پاکستان سے دشمنی رکھنے والے ممالک کی کمی نہ تھی سو سقوطِ ڈھاکہ کا دکھ ہماری تاریخ کو برداشت کرنا پڑا۔

تاریخ نے ہمیں وہی سب کچھ دیا ہے جو ہم اس کی جھولی میں ڈالتے آئے ہیں۔ اگر ملکی مسائل کا آئینی اور سیاسی حل تلاش کر لیا جاتا تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے قائم کردہ حمود الرحمٰن کمیشن نے اپنی رپورٹ تو پیش کر دی مگر اس کو عوام سے مخفی رکھا گیا۔ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ حکمران، سیاستدان اور عسکری قوت اس سانحے کی ذمہ دار تھی اسی لیے ہر حکومت نے اپنے مفادات کے لیے اس رپورٹ کو مخفی رکھا۔ تحقیقی ادارہ اس شکست کا ذمہ دار کسی ایک شخص کو قرار نہیں دیتا بلکہ اس میں بہت سے عوامل کار فرما تھے۔ سیاسی، معاشی، نفسیاتی، عسکری کمزوریوں نے مل کر ملک کو اس نہج تک پہنچا دیا تھا۔ ملک میں لگنے والے مارشل لاء سے سیاسی تحریکیں کھل کر اپنا کردار ادا نہیں کر سکیں اور ملک سازشوں کی نظر ہوتا چلا گیا۔ سیاسی قیادت نے بھی عقل مندی کا ثبوت دینے اور سیاسی مفاہمت کی بجائے جبر اور چالبازی کو فوقیت دی۔ بھٹو اور مجیب کا غیر لچک دار رویہ ملک کے ٹوٹنے کا ساماں بنا۔ اور یوں ہماری تاریخ میں ایک سیاہ باب ہمیشہ کیلئے رقم کر دیا گیا۔ وہ باب کہ جس کو ہم کبھی تاریخ کے اوراق سے مٹا نہیں سکتے۔ یہ ایک عالمی ندامت ہے جسے ہر باشعو مسلمان اور پاکستانی اپنے ضمیر کا بوجھ سمجھ کر جھیلتا ہے۔

سقوطِ ڈھاکہ کے اس المیے کو بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اس میں سیاسی و عسکری کمزوریوں اور ملک دشمن عناصر کی سازشی پالیسیوں کے ساتھ ساتھ جغرافیائی اور تاریخی حقائق بھی جڑے ہوئے ہیں۔ ایک ہی ملک کے دو حصوں کے درمیان زمینی رابطہ نہ ہونا ہی دراصل ایک ایسی حقیقت ہے جس نے دونوں حصوں کے عوام کے درمیان فاصلوں کو جنم دیا۔ انہی فاصلوں کی جگہ غلط فہمیوں نے لی، جو آگے چل کر ملک کے دولخت ہونے کی وجہ بنیں۔ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو بنگالیوں اور ہندوؤں کی ثقافتی اقدار میں ہم آہنگی بھی مشرقی اور مغربی پاکستانیوں کے درمیان دوری کا ایک اور بہت بڑا جواز ہے۔ یوں مجموعی طور پر یہ تمام عوامل اس عظیم اور تلخ سانحے کے ذمہ دار ہیں۔ اس لیے اس تاریخی المیے کو کسی ایک وجہ کے ساتھ جوڑ کر چند لوگوں یا کسی خاص گروہ کو موردِ الزام ٹھہرانا غلط ہے۔

حوالہ جات

۱۔ کمال متین الدین، نسلوں نے سزا پائی بحران ڈھاکہ (۱۹۶۸ء ۔ ۱۹۷۱ء) *(Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968-1971)*، مترجم ڈاکٹر محمد شیر از دستی، (لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء)، ص ۳۷۔

۲۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، (لاہور: حکایت پبلشرز، جنوری ۲۰۱۴ء)، ص ۶۹۔

۳۔ کمال متین الدین، نسلوں نے سزا پائی بحران ڈھاکہ (۱۹۶۸ء ۔ ۱۹۷۱ء) *(Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968-1971)*، ص ۳۵۔

۴۔ محمد اشفاق خان، سید فضیل ہاشمی (مترجمین)، حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ، (لاہور: طیب شمشاد پرنٹرز، ۲۰۱۸ء)، ص ۵۵۶۔

۵۔ قدرت اللہ شہاب، شہاب نامہ، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء)، ص ۵۸۴۔

۶۔ کمال متین الدین، نسلوں نے سزا پائی بحران ڈھاکہ (۱۹۶۸ء ۔ ۱۹۷۱ء) *(Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968-1971)*، ص ۱۱۲۔

۷۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، ص ۲۸۔

۸۔ روزنامہ ڈان (۱۰ فروری ۱۹۷۱ء)۔

۹۔ کمال متین الدین، نسلوں نے سزا پائی بحران ڈھاکہ (۱۹۶۸ء ۔ ۱۹۷۱ء) *(Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968-1971)*، ص ۱۳۸۔۱۳۹۔

۱۰۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، ص ۴۰۔

۱۱۔ کمال متین الدین، نسلوں نے سزا پائی بحران ڈھاکہ (۱۹۶۸ء ۔ ۱۹۷۱ء)

(Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968-1971)،
ص ۴۹۔

۱۲۔ مطیع الرحمٰن ،مشرقی پاکستان کی علیحدگی بھارت اور بڑی طاقتوں کا کردار، تلخیص و ترجمہ شمیم شاہ آبادی،(لاہور: نظریہ پاکستان ٹرسٹ) ،ص۹۴۔

۱۳۔ قطب الدین عزیز، خون اور آنسوؤں کا دریا (*Blood and Tears*)،مترجمین سلیم منصور خالد، ظہور احمد قریشی (لاہور:دی میج پریس، جنوری ۲۰۱۷ء)، ص۲۶۱۔

۱۴۔ محمد اشفاق خان، محمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ،ص۴۵۳۔

۱۵۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی،ص ۲۳۔

۱۶۔ کمال متین الدین، نسلوں نے سزا پائی بحران ڈھاکہ (۱۹۶۸ء ۔ ۱۹۷۱ء) *(Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968-1971)*،
ص ۳۵۴۔

۱۷۔ ایضاً،ص۲۳۲۔

باب دوم:

سقوطِ ڈھاکہ کے واقعات کی پیش کش اور نوعیت کا جائزہ

ہر ادیب اپنے مخصوص اسلوب اور انداز نگارش کی بنا پر اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ ادب کی کوئی بھی صنف ہو مصنف کا انفرادی طرزِ اظہار واقعات کی پیش کش اور اظہار کی نوعیت کو اپنے عہد کے دیگر لکھاریوں سے ممتاز بناتا ہے۔ انہی واقعات کی روانی اور تسلسل ادیب کی منظم شخصیت کی غمازی کرتے ہیں۔ واقعات کا چناؤ، پیشکش، ان کی ترتیب اور تسلسل اور تحریر میں بالواسطہ یا بلاواسطہ اثرپذیری، یہ تمام عوامل واقعات کی پیش کش اور نوعیت میں معاون ہوتے ہیں۔ ہر مصنف اپنے انداز سے واقعات کو پیش کرتا ہے۔ کہیں واقعات کی پیشکش میں حقیقت کا رنگ زیادہ غالب ہوتا ہے تو کہیں حقیقت کو مصلحت کے دبیز پردوں میں لپیٹ کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ کہیں واقعات تاریخ کا سینہ چاک کیے ملتے ہیں تو کہیں انہیں تعصب کی عینک لگا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس سب کے ساتھ یہ دیکھنا بھی لازم ہوتا ہے کہ کیا مصنف پیش کردہ واقعات کا چشم دید گواہ ہے یا کسی تیسرے فرد کی حیثیت سے سنی سنائی کہانی پیش کر رہا ہے۔ کیونکہ ثبوت اور دلائل کے ساتھ بات کرنا ہی قابل ستائش ہوتا ہے۔

مصنف کا واقعات سے براہ راست تعلق اس کے نقطہ نگاہ کا درست تعین کرتا ہے۔ اگر واقعات بلاواسطہ اثر پذیری کا نتیجہ ہوں تو ان کو ثابت کرنا اور اس کا تاثر قائم کرنا قاری کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ بعض دفعہ مصنف واقعات کی پیشکش میں طوالت سے کام لیتا ہے جبکہ دوسری طرف بعض مصنفین واقعات کو محض اختصار سے بیان کرنے پر ہی اکتفا کر لیتے ہیں۔ یہاں ایک اور بات قابل غور ہے کہ ادیب جس پیشے سے منسلک ہوتا ہے اس کے ظاہری و باطنی اثرات کہیں نہ کہیں اس کی تحریروں میں نظر آتے ہیں مگر یہ مصنف کی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ اپنے پیشے سے وابستگی کو کس طرح غیر جانبدارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ تاہم ادیب کی کسی بھی پیشے سے وابستگی واقعات کے چناؤ پر ضرور اثر انداز ہوتی ہے۔ یہاں مصلحت کو مد نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ جب حقیقت کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے تو وہ تحریر اپنی شناخت خود بنتی ہے۔ ظلم کے زمانے میں کلمہ حق کہنا بہت دلیری تصور کیا جاتا ہے اسی طرح کسی بھی پیشے سے وابستہ ادیب جب حساسیت اور حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے واقعات پیش کرتا ہے تو تاریخ ادب میں وہ فن پارہ آفاقیت کا حامل ہو جاتا ہے۔

اردو ادب کی ہر صنف میں اپنے عہد کے حالات وواقعات کو بیان کرنے کی گنجائش موجود رہی ہے۔ یہی واقعات ان اصنافِ ادب میں رقم ہو کر تاریخ ادب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ ایک ایسا الم ناک سانحہ ہے جس پر بہت سے مورخین، مصنفین، ناول نگاروں، افسانہ نگاروں اور دیگر شعبہ جات سے وابستہ افراد نے لکھا ہے۔ ہر مصنف نے اپنے مخصوص نقطہ نگاہ، مشاہدات، خیالات اور کہیں ذاتی پسند و ناپسند کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھا۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے تاریخ ساز دن سے لے کر آج تک یہ موضوع اور اس سے متعلقہ سوالات زیر بحث رہے ہیں۔ اس قدر وسیع اور دقیق موضوع پر اتنا کچھ لکھے جانے کے باوجود ان مباحث کا کوئی معروضی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ آج تک ہر مورخ و ادیب نے اپنے انداز میں اہل نظر کی تشفی کرنے کی کوشش کی۔ تاہم اس میں کچھ ایسی شخصیات بھی شامل ہیں جن کی تحریریں نہ صرف ادب بلکہ تاریخ میں بھی ایک سود مند اضافہ ہیں۔

اردو ادب کا ایک بہت بڑا نام مسعود مفتی ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے لکھی گئی ان کی افسانوی و غیر افسانوی نثر بہت اہمیت کی حامل ہے۔ ان کا شمار ان ۹۳ ہزار فوجیوں میں ہوتا ہے جو سقوط ڈھاکہ کے بعد قید کر دیے گئے اور ہندوستان کی جیلوں میں ۳ برس قیدِ بامشقت سے دوچار ہوئے۔ مسعود مفتی کی ڈھاکہ میں تعیناتی بطور سیکریٹری تعلیم کے ہوئی تھی۔ تاہم بیوروکریسی سے وابستگی مسعود مفتی کی ادب دوستی کو کم نہ کر سکی۔ اسی دوران سقوط ڈھاکہ کا وہ دلخراش واقعہ پیش آیا جسے ہم چاہ کر بھی تاریخ کے اوراق سے نہیں مٹا سکتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ان کی غیر افسانوی نثر میں ڈائری لمحے اور دو رپورتاژ چہرے اور ہم نفس شامل ہیں۔ چہرے اپنے اضافہ شدہ مواد کے ساتھ دوبارہ چہرے اور مہرے کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ابتدائے سفر سے لے کر اسیری کے دنوں میں لکھی گئی ان لازوال کتابوں سمیت مسعود مفتی کی ہر تحریر نے ہمیشہ قاری کو ایک حقیقت سے قریب تر تصور دیا۔

لمحے کے نام سے لکھی گئی ڈائری ایک تاریخی تسلسل کے ساتھ چلتی ہے۔ یہ ۲۲ مئی ۱۹۷۱ء سے ۱۰ جون ۱۹۷۱ء تک کے واقعات کی مختصر داستان غم ہے۔ لمحوں کی رفتار کے عنوان سے اس حصے کی ابتداء ہوتی ہے۔ لمحے مشرقی پاکستان کے ختم ہونے کے واقعات ایک ایسے تدریجی تسلسل کے ساتھ پیش کرتی ہے جس کو پڑھ کر قاری یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ ہمارا مشرقی بازو کس طرح ہم سے جدا ہوا تھا۔ جزئیات نگاری، منظر نگاری، حقیقت نگاری اور دیگر تمام ادبی و فنی لوازمات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ ڈائری ۱۹۷۱ء کے ان چند دنوں کی سرگزشت ہے جو مسعود مفتی نے انتہائی کرب اور درد کے عالم میں گزارے تھے۔

ڈائری میں واقعات کو مختصراً بیان کیا گیا ہے جس سے بوریت کا احساس بالکل نہیں ہوتا ہے۔ حقیقت کی مکمل تصویر کشی کے ساتھ ساتھ ان تصاویر کو بھی چھاپا گیا جو اس وقت انہوں نے اپنے کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کی تھیں۔ یہ ایک ایسے محب وطن پاکستانی کے دل کی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے جو اپنے ملک کے ٹوٹنے پر مکمل طور پر بکھر چکا تھا۔ ایک حساس اور درد مند انسان کے لیے ایسے تلخ تاریخی واقعات نہ صرف قومی بلکہ ذاتی المیہ بھی ہوتے ہیں۔ ڈائری میں موجود ہر واقعہ اور ہر پلٹتا صفحہ ہمیں نہ صرف ان حقائق سے روشناس کرواتا ہے بلکہ ہمیں احتساب کے اس کٹہرے میں بھی لا کھڑا کرتا ہے جہاں ہر انسان اپنا احتساب کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ مسعود مفتی اپنے احساسات اور خیالات کو ان سوالات کا روپ دے کر پیش کرتے ہیں جو پڑھنے والے کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ان کا مدلل جواب تلاش کریں۔ مسعود مفتی نے ڈائری کے اختتام پر احتساب کا ایک ایسا انداز اختیار کیا کہ کوئی بھی اس دلیل کو رد نہیں کر سکتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے واقعات کے چشم دید گواہ کی حیثیت سے انہوں نے وہ سب کچھ بہت قریب سے دیکھا تھا جو تاریخ کے اوراق میں اتنی صراحت سے نہیں ملتا۔ سچ کو سچ ہی بیان کرنا ان کی تحریروں کا خاصہ ہے جسے اس ڈائری کو پڑھتے ہوئے بہت واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مئی ۱۹۷۱ء سے شروع ہوتی اس سرگزشت کا آغاز جہاز کے سفر اور مناظر کے بیان سے ہوتا ہے۔ ڈائری میں ہر گزرتے دن کی ایک دل دہلا دینے والی داستان رقم ہے۔ چوں کہ مسعود مفتی براہ راست اس واقعے سے وابستہ ہیں اس لیے ان کی تحریر میں ان واقعات کا بیان زیادہ ملتا ہے جو حقیقت پر مبنی تھے یا آنکھوں دیکھے حالات تھے۔ مغربی پاکستان میں انہیں جن حالات کے متعلق آگاہ کیا گیا تھا اور جس انداز سے حالات کے نارمل ہونے کے متعلق تسلی دی گئی تھی معاملہ اس کے برعکس تھا اور اس بات کا اندازہ انہیں ڈھاکہ پہنچ کر ہو گیا تھا۔ کہتے ہیں:

> سوا تین بجے طیارہ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے کی طرف جھپٹا گھڑی کو ایک گھنٹہ آگے کرتے ہوئے میں نے نیچے میلوں لمبی سڑکوں پر نگاہ دوڑائی تو ان پر اکا دکا راہ گیر تھے۔ بوڑھے کے اکیلے دو کیلے دانتوں کی طرح ایک آدھ رکشا یا کار نظر آئی جب ذرا نیچے ہوئے تو مکانات خاموش تھے اور مکیں بہت کم تھے۔ عجیب بات ہے۔ اُدھر تو سنتے تھے کہ سب نارمل ہے۔[1]

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انہوں نے ڈھاکہ میں گردوپیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا تھا۔ لوگوں کی حالت زار بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ڈھاکہ شہر کی حالت کے متعلق بھی آنکھوں دیکھا حال بیان کیا تھا۔ کہتے ہیں:

> ریلوے لائن نصف سے زیادہ اکھاڑی جا چکی ہے۔ اکثر پل توڑے جا چکے ہیں۔ سڑکیں بھی جگہ جگہ سے تباہ ہیں اس لیے صرف دریا استعمال ہو رہے ہیں۔[2]

مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج نے مل کر جو تباہی و بربادی برپا کی تھی اس کا حال وہ وقفے وقفے سے بیان کرتے جاتے ہیں۔ ڈھاکہ میں متاثرین سے براہ راست ملنے کے بعد انہوں نے ان کے حالات وواقعات اور ذہنی کشمکش کو اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے۔ مسعود مفتی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ ان واقعات کو پیش کریں جو انسانی زندگیوں سے قریب تر ہوں جہاں لوگوں نے تاریخ کے وہ ہولناک فسادات دیکھے جن کی مثال کہیں نہیں ملتی ہے۔ ان واقعات کی کہانی زبان کے تنازعے سے شروع ہو یا ثقافت کے فرق سے اس کا اختتام اتنا بھیانک ہے کہ اس کو بیان کرتے ہوئے لکھاری اور پڑھتے ہوئے قاری آنکھ نم کیے بنا نہیں رہ سکتا ہے۔ پرفیسر فتح محمد ملک اپنے ایک مضمون مسعود مفتی کا شہر افسوس میں ان کے ادب کا موازنہ سقوطِ ڈھاکہ کے موضوع پر انتظار حسین کے افسانے شہر افسوس سے کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں:

> مسعود مفتی ہم سب کو یہ گھڑی یاد دلانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں اور گزشتہ پندرہ برس سے ہمیں اس مقام عبرت کی سیر کرانے میں مصروف ہیں۔[3]

ڈھاکہ میں اپنے ان ذاتی تجربات و واقعات کا ذکر کرتے ہوئے وہ اس ملاقات کا ذکر کرتے ہیں جب کھلنا گرلز کالج کی پرنسپل نے ان سے مل کر انہیں اپنی داستان غم سنائی۔ جس کو سن کر اندازہ ہوتا ہے کہ لسانی تعصب نے ایک ہی ملک کے لوگوں کو کس طرح ایک دوسرے سے جدا کر دیا تھا۔ انسانوں کو درندہ بننے میں چند لمحے لگے تھے۔ مسعود مفتی اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کھلنا گرلز گالج کی پرنسپل ڈاکٹر حفیظ آئیں بڑی شستہ اردو بولتی ہیں۔ فارسی میں پی۔ ایچ ڈی ہیں کلکتہ کی رہنے والی ہیں اور ہر لحاظ سے بنگالی ہیں مگر اس کے باوجود مارچ کے پاگل پن میں مجیب کے ساتھیوں نے ان کے بھائی کو صرف اس لیے مار ڈالا کہ وہ اردو اچھی بولتا تھا۔[4]

مسعود مفتی نے صرف ان واقعات پر اکتفا نہیں کیا جن سے وہ دوچار ہوئے بلکہ وہ براہ راست ان لوگوں سے بھی ملے جو مختلف مقامات پر ظلم و بربریت کا نشانہ بنے تھے یا جنھوں نے ان مناظر کو دیکھا تھا۔ مسعود مفتی نے اس ڈائری میں ایسے چشم دید گواہوں سے لیے گئے انٹرویو سے متعلقہ چند باتیں بھی شامل کیں جن کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ راج شاہی، چٹاگانگ اور دیگر علاقوں میں کس طرح تشدد کیا جارہا تھا۔ انسانیت دریا کنارے کھڑی سسکتی رہی اور سفاکیت کی ہر حد کو بنی آدم نے نہایت آسانی سے پار کر لیا۔ مسعود مفتی نے ان واقعات کو بہت واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ میمن سنگھ کے محلہ شانکی پاڑا سے متعلق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

اس محلہ میں سبھی غیر بنگالی تھے۔ پہلے مردوں کو گولیوں سے قتل کیا گیا۔ پھر ان کی بیویوں، ماؤں، بہنوں سے کہا گیا کہ ان کی قبریں کھودیں۔۔۔ کسی کی آنکھیں نکال لی گئی تھیں۔ کسی کے بازو کاٹ دیئے گئے تھے۔ کسی کا سر غائب تھا اور اس سارے کام کی نگرانی مسلح لوگ کر رہے تھے۔[۵]

ڈھاکہ میں ہونے والے فسادات کے چشم دید گواہ کی حیثیت سے وہ جن حالات و واقعات کا ذکر کرتے ہیں وہ مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج کی درندگی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ایک حساس اور صاحب نظر انسان ہونے کی حیثیت سے ان کا دل و دماغ ان حالات کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایک ہی ملک میں رہنے والے ایک دوسرے کے خون کے اس حد تک پیاسے کیسے بن گئے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

میں کافی دن بعد وہ ریسٹ ہاؤس دیکھنے گیا جو MISKAH ہوٹل کے سامنے ہے اور شہر کے سترہ ذبح خانوں میں سے ایک تھا۔ ذبح خانے سے مراد وہ جگہ تھی جہاں غیر بنگالیوں کو لے جا کر قتل کیا جاتا تھا۔ وہاں فرش پر خون کی پپڑیاں جمی تھیں اور مکھیوں کے ہجوم بھنبھنا رہے تھے۔ نظارہ اتنا دلدوز تھا کہ میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔[۶]

ایسے بہت سے دل دہلا دینے والے واقعات ہیں جو مضبوط سے مضبوط انسان کے اعصاب کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسے میں مسعود مفتی جیسا حساس انسان ان حالات میں متاثر ہوئے بنا کیسے رہ سکتا تھا۔ آپ ایسے بہت سے افراد سے بھی ملے جن کے عزیز و اقارب اور قریبی رشتوں میں سے کوئی بھی باقی نہیں بچا تھا۔ بے سر و سامانی کی اس حالت میں ہر کوئی اپنے اپنے زخموں کا بوجھ اُٹھائے زندہ لاش کی مانند پھر رہا تھا۔ مسعود مفتی نے براہ راست ان جگہوں کا جا کر معائنہ کیا جہاں مکتی باہنی کے مظالم کے متاثرین موجود تھے۔ کیمرے کی آنکھ نے ان مناظر کو محفوظ بھی کیا جہاں زندہ انسانوں کے اعضاء گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیئے گئے تھے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

رابعہ بہر اب بازار کی خاتون ہے۔ جوان عمر ہے۔ کوئی ۲۵ برس کی۔ کندھے پر کلہاڑی کے زخم اور ہنسلی کی ہڈی ٹوٹی ہوئی۔ زخم تو اب ٹھیک ہو رہے تھے مگر بھرے پرے گھرانے کے مرے ہوئے لوگ اب کہاں سے واپس ملیں گے۔[۷]

سقوط ڈھاکہ سے قبل فسادات میں اس حد تک شدت تھی کہ اندازہ کرنا مشکل تھا کون آپ کا حامی اور کون مخالف ہے۔ مسعود مفتی نے جن انسانیت سوز واقعات کا ذکر کیا ہے وہ بنگالیوں کی نظر میں درست تھے۔ کیونکہ بنگالیوں کی طرف سے کیے گئے مظالم ان آزاد بنگلہ دیشیوں کے لیے جرات و بہادری کے واقعات تھے۔ چٹاگانگ میں

عوامی لیگ کے کارکنوں نے غیر بنگالیوں کو مارنے کا جو انداز اپنایا تھا وہ ذرا مختلف تھا ایک عینی شاہد سے کیے گئے انٹرویو میں پتہ چلا کہ:

> چٹا گانگ میں ذرا سائنٹفک طریقے سے موت کا تماشہ دیکھا گیا۔ عوامی لیگ کے کارکن غیر بنگالیوں سے تقاضا کرتے تھے کہ بنگلہ دیش سے وفاداری کے اظہار میں خون کا عطیہ بلڈ بینک میں دیں کسے انکار کی مجال تھی۔ وہاں جب خون دینے جاتے تو کرسی پر بٹھا دیا جاتا اور رسی سے باندھ دیا جاتا اور بازو میں نلکی لگا کر سارا خون بہہ جانے دیا جاتا۔ اس طرح خون کے کتنے ہی ڈرم اکٹھے کیے گئے اور وہ لوگ کرسی میں جکڑے جکڑے مر جاتے۔[۸]

ظلم و تشدد کی یہ وارداتیں صرف نوجوانوں تک محدود نہیں تھیں، وہاں عزتوں کے لٹیرے بھی جگہ جگہ دندناتے پھرتے تھے۔ ظلم و تشدد کی وہ تاریخ رقم کی گئی جس کی مثال نہیں ملتی۔ فسادات میں یہ تمیز مٹ چکی تھی کہ جبر کا نشانہ بننے والی خواتین کوئی اور نہیں پاکستانی مسلم خواتین تھیں، مگر آزاد بنگلہ کے متوالوں نے ان کو صرف دشمنی کی نگاہ سے دیکھا۔ مسعود مفتی صاحب براہ راست ایسے بہت سے لوگوں سے ملے تھے جنھوں نے بچوں اور خواتین کے ساتھ ہونے والے مظالم دیکھے تھے۔ رحم کی امید پر جینے والے مغربی پاکستانی اور بہاریوں کو معلوم نہ تھا کہ ظلم کی رات ابھی بہت لمبی تھی۔ نسلی و قومی تعصبات اس قدر حاوی تھے کہ متحدہ پاکستان کہیں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ محمد احسان الحق نامی ایک چشم دید گواہ سے گفتگو کو مختصراً بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> آخری دنوں میں بہت تیزی سے قتل کیے اور جن گھروں کے مرد مار دیتے۔ ان کی عورتوں کو بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح سڑک پر اِدھر اُدھر گھماتے رہتے۔ کئی ہندو بھی ہندوستان سے آئے ہوئے تھے اور وہ بھی ایسٹ پاکستان رائفلز کی وردیاں پہنے گھومتے رہتے۔ یہ عورتیں ان کو عیاشی کے لیے پیش کر دی جائیں۔[۹]

ایسے واقعات کی تصدیق تاریخ کی بے شمار کتابوں میں بھی موجود ہے عنایت اللہ کی لکھی گئی کتاب ہماری شکست کی کہانی میں اسی طرح کے واقعات کے متعلق لکھا گیا ہے کہ:

> بعض فوجیوں نے بتایا کہ وہ مسجدوں میں گئے تو وہاں لڑکیوں کی برہنہ لاشوں کے انبار پڑے تھے۔ انہیں مسجدوں میں بے آبرو کر کے انہیں بکروں کی طرح ذبح کیا گیا تھا۔ خون اتنا زیادہ تھا کہ پاؤں خون میں دھنستے اور پھسلتے تھے۔[۱۰]

مسعود مفتی صاحب نے سقوط ڈھاکہ سے قبل کے فسادات کے سلسلے میں کوشش کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ ایسے لوگوں کے حالات وواقعات کو قلم بند کر سکیں جو براہ راست تشدد کا نشانہ بنے تھے۔ وہ وزیر تعلیم کی حیثیت سے ڈھاکہ میں تعینات کیے گئے تھے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ان کا تعلق کس عہدے اور پیشے سے وہ ایک حساس اور درد مند دل رکھنے والے ادیب تھے۔ ادیب کا انتشار کے زمانے میں خاموش رہنا ناقابل معافی جرم ہوتا ہے اور وہ اس جرم کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتے تھے۔ زباں خنجر اور قلم تلوار کی مانند دونوں متحرک تھے اور وہ مسلسل ایسے لوگوں کی تلاش میں تھے جو تاریخ کے اِن الم ناک لمحات کو محفوظ کرنے میں ان کی مدد کریں۔ ایک عینی شاہد سے کی گئی گفتگو کو اِس طرح بیان کرتے ہیں:

> کسی آدمی کو گولی مارتے وہ زخمی ہو کر گرتا اور کلمہ پڑھتا تو گالیاں دیتے اور کہتے "بولو جے بنگلہ" اگر وہ نہ بولتا تو منہ پر پیشاب کرتے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ پر کودتے کہ پہلے اندر والے کو ماریں گے پھر تمہیں ماریں گے۔ لاشوں کو رسیاں باندھ کر گلیوں میں گھسیٹتے رہتے۔[11]

یہ تمام واقعات مسعود مفتی صاحب نے مختصراً اپنی ڈائری لمحے میں پیش کیے ہیں۔ تاہم ان کی پیشکش میں انھوں نے ثبوت اور دلائل بھی پیش نظر رکھے ہیں۔ جن عینی شاہدین سے بھی ان واقعات کے متعلق پوچھ گیا ان میں اکثریت نے اپنی داستان غم سنانے کے بعد یہ کہا تھا کہ پاکستانی فوج آئی اور انہیں اس ظلم سے نجات دلائی۔ بحیثیت بیوروکریٹ مسعود مفتی نے حتی الامکان کوشش کی کہ کسی بھی تعصب سے بالاتر ہو کر عسکری کاوشوں کو اس طرح پیش کریں جیسا کہ وہ کی گئیں تھیں۔ انہوں نے نہ صرف لوگوں کے تاثرات اور واقعات کو قلم بند کیا بلکہ حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے احتساب کا عمل بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ ایک صاحب علم ادیب کی حیثیت سے انہیں اِس بات کا ادراک تھا کہ قومیں کب زوال پذیر ہوتی ہیں۔ اس بات کی آگاہی نے ان سے وہ لمحے محفوظ کروائے جو حقیقت کے ساتھ ساتھ احتساب کا میزان بھی سنبھالے ہوئے تھے۔ ۳۰ مئی ۱۹۷۱ء کو ایک عینی شاہد نثار احمد نے اپنی بپتا سنانے کے بعد مسعود مفتی سے کہا کہ:

> ۲۳ تاریخ کو فوج کے آنے کی اطلاع ملی تو ہم نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ شور سن کر فوج اُدھر پہنچ گئی اور ہمارا حال دیکھ کر بہت سے فوجی بے اختیار رو پڑے پھر انہوں نے بندوبست کیا اور ۳ تاریخ کو بذریعہ ریل ہم ڈھاکہ پہنچے۔[12]

ایک طرف پاکستانی فوج اگر مسیحا بن کر آئی تھی تو تصویر کا دوسرا رُخ اس سے بالکل مختلف تھا۔ مشرقی پاکستان میں افواج پاکستان کے متعلق غلط افوائیں فوجی ایکشن سے پہلے ہی پھیلنا شروع ہو گئیں تھیں۔ جو اِس بات کی

غمازی کرتی ہیں کہ ان دشمن عناصر نے تقسیم کی کوششیں بہت پہلے ہی شروع کر دی تھیں۔ مسعود مفتی نے تصویری اور تحریری حقائق دے کر یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ آرمی ایکشن سے قبل ہی اخبارات اور افواہوں کا تسلسل بہت سی خرابیاں پیدا کر چکا تھا۔ مگر یہاں بھی وہ احتساب کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ۲۱ مارچ کے پرچے کے پہلے صفحے کے ایک چوتھائی حصے پر ایک بنک کا اشتہار ہے انگریزی کے اخبار میں اشتہار کا متن بنگالی میں ہے اور بنگلہ دیش کے بہت بڑے نقشے پر سورج طلوع ہوتا دکھایا گیا ہے۔ ۲۳ مارچ کے صفحے پر اتنا ہی بڑا اشتہار ہے۔ مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے نقشے پر مجیب کا فوٹو ہے اوپر جلی قلم میں لکھا ہے۔
>
> Dedicated To The Development Of Bangladesh اور نیچے تجارتی ادارے کا نام درج ہے۔ [۱۳]

مسعود مفتی نے اس ڈائری میں ان واقعات اور حالات کو پیش کیا جن کے وہ چشم دید گواہ تھے یا جن عینی شاہدین سے وہ ملے تھے۔ واقعات کی نوعیت زمینی حقائق وہ حقائق تھے جو گریبان چاک کیے ڈھاکہ کی گلیوں میں پھر رہے تھے اور متحدہ پاکستان پر ہنس رہے تھے۔ تاریخ نے اس سے زیادہ سفاک مناظر نہیں دیکھے ہوں گے جب ایک ہی ملک کے دو حصے آپس میں دست و گریبان تھے ایک اور اخبار کا ٹکڑا پیش کرتے ہیں کہ:

> Victory is a must for Bangalese Nation, Bangladesh is destined to be free soil. یعنی یہ اعلان ۲۴ مارچ کو ہو رہا ہے جب بنگالی پاکستان کے شہری ہیں اور ان کا صوبہ پاکستان کا حصہ ہے۔ [۱۴]

یہ تمام واقعات ایک دن کا نتیجہ نہ تھے یہ وہ لاوا تھا جو پاکستان بننے کے بعد سے پکنا شروع ہوا تھا۔ بنگلہ دیش کی تاریخ میں ایسے لوگ ہمیشہ سے پیدا ہوتے رہے ہیں جن کا تاریخ بدلنے میں حصہ رہا ہے۔ بیرونی سازشیں ایک طرف خود ملک دشمن عناصر نے پاکستان کو اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا جہاں اپنے ہی ملک میں غداروں سے نمٹنے کیلئے فوجی ایکشن کرنا پڑا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا ہو گا کہ ایک ہی ملک کے کسی صوبے میں اپنے ہی لوگوں نے اپنے بھائیوں کو مار ڈالا ہو اور ظلم و جبر کی وہ کہانیاں مشہور ہوئیں جن کو پڑھ کر دل پسیج جاتے ہیں۔ بنگلہ دیش کے خطہ سے متعلق مسعود مفتی لکھتے ہیں کہ:

اس خطے کی تاریخ دوبارہ پڑھنے کی ضرورت ہے، خصوصاً میر جعفر کے زمانے کی۔ جہاں تک غداری کا سوال ہے میر جعفر کا قصہ بھی بنگال کا ہے اور شیخ مجیب الرحمٰن کا قصہ بھی یہیں کا ہے۔ یہ چند شواہد مگر میرے سوال کا شافی جواب تو تاریخ پڑھنے سے ہی نکل سکے گا۔ [15]

قوموں کا رویہ ملک کی سلامتی اور بقا میں بہت اہم کردار ادا کرتا ہے اور مسعود مفتی اس بات کو نہ صرف محسوس کرتے ہیں بلکہ اپنے قومی رویوں پر تنقید کرتے ہیں یہ تنقید صرف تنقید تک محدود نہ تھی بلکہ یہ وہ احتسابی رویہ تھا جو وہ اپنی قوم کے ہر فرد میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اپنی تحریر لمحے میں جہاں وہ واقعات اور خیالات کو بیان کرتے ہیں وہیں ان کے اندر کا ادیب قاری کو ایک دفعہ یہ سوچنے پر ضرور مجبور کرتا ہے کہ ہم بحیثیت قوم کہاں کھڑے ہیں۔ لکھتے ہیں:

ہماری قوم کی پرانی عادت ہے کہ حقیقتوں سے گریز کرتی ہے۔ حالات کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات نہیں کر سکتی۔ میدان جنگ میں بہادر قوم ہونے کے باوجود عام زندگی میں بزدل ترین قوم ہے جو سچ کہنے اور سچ سننے کا حوصلہ نہیں رکھتی اور اخلاقی جرات سے ایک دم خالی ہے۔ [16]

احتساب کے اس عمل میں وہ اپنی ذات کو بھی شامل حال رکھتے ہیں۔ مسعود مفتی نے جہاں ان مظالم کا ذکر کیا جو غیر بنگالیوں اور بہاریوں پر کیے گئے تھے وہیں وہ اس بات پر بھی بحث کرتے ہیں کہ تمام بنگالی آزاد قومیت کے حق میں نہیں تھے۔ ان کی اکثریت متحدہ پاکستان چاہتی تھی مگر باغیوں کے اس طبقے نے بے قصور لوگوں کو بھی دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج کے ساتھ جو بھی بنگالی شامل تھے انہوں نے بے گناہ بنگالیوں کی ذات کو بھی شکوک و شبہات کے دائرہ کار میں داخل کر دیا تھا۔ ایسا بھی ہوا کہ پاکستانی فوج نے ان بنگالیوں سے تفتیش کی جو متحدہ پاکستان کے حامی تھے اور یوں گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پسنے لگا۔

بطور سیکرٹری تعلیم انہوں نے سات ماہ مشرقی پاکستان میں، ایک ماہ بنگلہ دیش میں اور پھر دو سال ہندوستانی قیدی کی حیثیت سے گزار رہے تھے۔ اس دوران ناقص نظام تعلیم کے جو اثرات انہوں نے دیکھے وہ بہت ہی بھیانک تھے۔ بنگالی سیاسی طور پر بالغ مگر جذباتی قوم ہے انہیں ادراک تھا کہ مغربی پاکستان کی توجہ مشرقی پاکستان کے نظام تعلیم کو درست کرنے پر نہیں رہی تھی۔ اس بات کا اندازہ انہیں تب ہوا جب ایک بنگالی نے انہیں یہ بتایا کہ پاکستانی فوج انہیں تنگ کرتی ہے۔ حالانکہ ان کا بیٹا باغی ہے وہ مکمل پاکستان کے ساتھ ہیں لیکن کوئی ان کی بات کا یقین نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنا قصور پوچھنے لگے تو مسعود مفتی نے کہا کہ:

میں نے از راہِ ہمدردی اتنا کہہ دیا کہ آپ کو تو خواہ مخواہ اپنے بیٹے کے قصور کی سزا مل رہی ہے تو وہ ناراض ہو کر بولا: مجھے اپنے بیٹے کے قصور کی سزا نہیں مل رہی۔ بلکہ آپ کے قصور کی سزا مل رہی ہے۔ بحیثیت ایجوکیشن سیکٹری آپ جس کرسی پر بیٹھے ہیں۔ مجھے اس کرسی کے تساہل کی سزا مل رہی ہے۔ میرا بچہ پیدائشی پاکستانی تھا آپ کے نظام تعلیم نے اسے غیر پاکستانی بنا دیا یہ کہاں کا انصاف ہے کہ میں تو اس ملک کے قیام کی تحریک میں تن، من اور دھن لُٹا دوں اور یہی ملک پہلے تو میرا بیٹا بگاڑ دے اور پھر مجھے اس کے بگڑنے کی سزا دے۔ [17]

ڈائری **لمحے** کا دوسرا حصہ **لمحوں کی سوچ** کے عنوان سے ہے۔ اس کو پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسعود مفتی نے اس حصے میں اپنے ذہنی سفر کی داستان کو بیان کیا ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے فسادات میں ان کا جسم تو قید میں رہا مگر ذہنی و روحانی سفر مسلسل جاری رہا۔ اس دوران قرآن پاک نے جس طرح ان کی راہنمائی کی اس کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے سوالات کے جوابات تلاش کیے جو سقوطِ ڈھاکہ کے فسادات کے حوالے سے ان کے ذہن میں مچلتے تھے۔ انہوں نے ایسے بہت سے لوگوں کے انٹرویو کیے جو فسادات کا براہ راست نشانہ بنے۔ انسانیت سوز واقعات سنے تھے اور دل دہلا دینے والے مناظر دیکھے تھے یہاں تک کہ تشدد کے ایسے انداز دیکھے کہ انسانی ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ یہاں مسعود مفتی براہ راست اجتماعی صورت میں قوموں کے کردار اور رویوں کو مد نظر رکھتے ہوے قرآن پاک سے حوالہ جات پیش کرتے ہیں۔ جن کو پڑھ کر انسان احتساب کے عمل میں داخل ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک سے وابستہ ہو کر انہوں نے ایک ایسا جذباتی تعلق قائم کیا جس نے ہمیشہ اُن کی راہنمائی کی۔

قوموں کے اخلاقی رویے کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے اس بات کو سمجھا اور بیان کیا ہے کہ انبیاء کی اصلاحی کوششوں کے باوجود قومیں اپنی کسی نہ کسی بری خصلت کی وجہ سے عذاب کا شکار ہوئیں، مگر ہم ان برائیوں کا مجموعہ ہیں پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم متحدہ پاکستان میں رہتے۔ یہ حقیقت ہے کہ قومیں جب تدبیر سے کام لینا چھوڑ دیتی ہیں اور زیادتی کرتی ہیں تو خدا کے قانون کے مطابق تباہی ان کا مقدر بنتی ہے۔ سورہ الحجرۃ کی آیت نمبر ۴ میں اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں کہ:

ہم نے کبھی کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا۔ تاوقتیکہ اس کو زندگی کا مقررہ موقع نہیں دیتے۔ [18]

قرآنی آیات کے حوالہ جات سے اپنی بات کو نہایت مدلل انداز میں پیش کیا۔ مختلف قوموں کے حالات و واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے جب اپنی قوم سے اس کا موازنہ کرتے ہیں تو موازنے کا تجزیہ اس طرح کرتے ہیں کہ ہماری قوم کے ساتھ بالکل درست ہوا بلکہ بہت کم ہوا، ورنہ خدا کی ذات اس سے کہیں زیادہ پر قادر تھی۔ مسعود مفتی

ڈائری کے اختتام پر ان سوالوں کے جوابات تلاش کر چکے تھے جو بحیثیت پاکستانی احتساب کے عمل کا حصہ تھے۔ لکھتے ہیں کہ:

> جواب یہ تھا کہ جن چھ قوموں کو خدا کی طرف سے سزا ملی ان میں ہر ایک میں چند خرابیاں تھیں جو اس قوم کے لیے مخصوص تھیں مگر حیف یہ ہے کہ پاکستانی قوم میں مجموعی طور پر وہ تمام خرابیاں موجود ہیں جو فرداً فرداً ہر قوم میں تھیں۔ [19]

اپنی وارداتِ قلبی کو احتسابی عمل سے جوڑ کر مختصراً انہوں نے جن واقعات کا چناؤ کیا ان کا تعلق ان حالات و واقعات سے تھا جو بحیثیت انسان، بیوروکریٹ اور پاکستانی انہیں پیش آئے تھے۔ ان حصوں کو شامل کرنے سے گریز کیا تھا جن کا تعلق خالص سرکاری معاملات سے تھا۔ واقعات کو ایک ترتیب اور تاریخی تسلسل کو مد نظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا تھا۔ حقائق کی اس قدر مختصر اور جامع انداز میں وضاحت جس خوبصورتی سے مسعود مفتی صاحب نے کی یہ انہی کا طبیعت کا خاصہ ہے۔ قاری کی دلچسپی اور ادب کے تمام لوازمات کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی یہ ڈائری سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ادب میں بہت اہمیت کی حامل ہے۔

ہم نفس مسعود مفتی کا سقوط ڈھاکہ سے متعلق رپوتاژ ہے جس کا مرکزی کردار بھولا ایک سیدھا سادا بنگالی جوان تھا جو پاکستان سے بے حد محبت کرتا تھا۔ بھولا ایک ایسا حقیقی کردار ہے جو ایک ایسے محب وطن پاکستانی کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے جو متحدہ پاکستان کے حامی تھے مگر عوامی لیگ کی اقلیت نے انہیں پاکستان سے بنگلہ دیش منتقل کر دیا تھا۔ بھولا دم توڑتے مشرقی پاکستان کا وہ معصوم کردار ہے جو سراپا سوال ہے کہ وفادار بنگالیوں کا کیا تصور تھا۔ جو مغربی پاکستان کے حکمرانوں کی پالیسیوں، مجیب الرحمٰن کی سازشوں اور نظام تعلیم چلانے والوں کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے۔ اس رپورتاژ کو منظر نگاری، کردار نگاری، حقیقت نگاری اور تمام فنی و ادبی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھا گیا۔

یہ رپوتاژ مسعود مفتی کی زندگی کا وہ تجربہ تھا جس نے نہ صرف انہیں بلکہ حساس قاری کو بھی خون کے آنسو رلایا ہے۔ افسانوی انداز میں شروع ہوتی یہ غیر افسانوی نثری تصنیف ایک ایسے سچے پاکستانی کی کہانی کو ساتھ لے کر چلتی ہے جو مشرقی پاکستان کی علیحدگی پر اتنا ہی متفکر تھا جتنا کوئی بھی حساس اور دردمند دل رکھنے والا انسان ہو سکتا ہے۔ واقعات کے چناؤ میں ہمیں مسعود مفتی اور بھولا کے ا ایک ساتھ گزرے بہت سے لمحات اور واقعات ملتے ہیں جس میں بہت سود مند بحث و تکرار بھی شامل ہے۔ اس میں سقوط ڈھاکہ، مسعود مفتی کے قید و بند کے مختصر حالات، ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں محصور دنوں کی داستان، جنگ کے آنکھوں دیکھے حالات و واقعات، لوگوں کے منافقانہ طرز عمل اور

نفسیات کا جائزہ، ملکی ریشہ دانیوں کا ذکر، متحدہ پاکستان کا بوگس نظام تعلیم، اپنے ذاتی خیالات و احساسات جو نہایت مدلل تھے اور سب سے بڑھ کر بھولا اور دیگر کرداروں کے ساتھ گفتگو شامل ہے۔ ان تمام موضوعات کو مختصر مگر نہایت جامع انداز میں ترتیب سے مثالوں اور شہادتوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

یہاں ان جذباتی لمحات کو بھی قلم بند کیا گیا ہے جو سقوط مشرقی پاکستان کے بعد بھولا اور مسعود مفتی کے مابین گزرے۔ یہ وہ لمحات تھے جب ایک ہی ملک کے لوگ مختلف شہریت کے حامل ہو گئے تھے۔ یہ کرب بھولے کے ہر انداز سے جھلکتا محسوس ہوتا ہے جو ایک ذاتی المیہ بن کر اس کے رگ و پے میں دوڑتا تھا۔ اس کرب کی شدت اتنے برس گزرنے کے بعد ان کی ملاقات پر بھی زائل نہیں ہوئی تھی۔ واقعات میں سیاسی معاملات کو کم اور زمینی حقائق اور پیش آنے والے برہ راست واقعات پر زیادہ توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ بحیثیت بیوروکریٹ وہ اپنے عہدے (وزیر تعلیم) اور اس سے متعلقہ ذمہ داریوں کا ذکر تو کرتے ہیں مگر اس میں ایک حساس ادیب کبھی بھی پیچھے نہیں رہا ہے۔ یہاں کسی حد تک عسکری طاقتوں کے اس طرز عمل کا بھی ذکر ملتا ہے جن کا دوران قید انھیں تجربہ ہوا۔

ملائیشیا، تھائی لینڈ، فلپائن، ہندوستان، مشرقی پاکستان اور پاکستان میں گزرا ہوا وقت جو کسی بھی حوالے سے متحدہ پاکستان، احتساب اور تہذیبوں سے متعلق تھا اس کا ذکر اس ریوتاژ کا حصہ ہے۔ مسعود مفتی نے مختصراً ان حالات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی اور ان تمام اسباب و عوامل کو تلاش کرنے کی کوشش کی جنہوں نے پاکستان کو دولخت کر دیا۔ قومی سستی کو مد نظر رکھتے ہوئے مختلف مصنفین کی کتب سے حوالہ جات بھی پیش کیے اور ہمارے نظام تعلیم کی خامیوں کو واضح کرنے کی کوشش کی جس نے ۱۹۴۷ء کے بعد کی ہماری نسل کو بغاوت کی اس نہج پر لا کھڑا کیا تھا جو ہندو اساتذہ کی تربیت کا نتیجہ تھی۔ چنانچہ قومیت، تہذیب، ثقافت، رنگ و نسل غرض ہر شے میں بنگالی ہندوؤں کو تو قبول کر لیتے تھے مگر بہاری اور مغربی پاکستان ان کو قبول نہ تھا۔ اس ریوتاژ میں بھولا ایک ایسی علامت بن کر ظاہر ہوتا ہے جو ہر مقام پر ایک سوال چھوڑ جاتا ہے جس کا جواب شاید مؤرخین بھی دینے سے قاصر ہیں۔ تاہم انفرادی سطح پر احتساب کا عمل ممکن ہے۔

ریوتاژ کا آغاز بھولا کی بیماری سے ہوتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ گزشتہ برسوں کی داستان کھلتی ہے جس میں سول سروس اکیڈمی کی ٹریننگ سے لے کر بنگلہ دیش میں تعیناتی اور انگلستان میں ٹریننگ تک کا مختصراً احوال درج ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً عالم اسلام اور اہل مغرب کی تعلیم کی طرف رغبت کی نوعیت بھی شامل بحث رہی۔ نیز سفید فاموں کے پاکستان کے متعلق منفی خیالات کا ذکر کرتے ہیں اور ان قومی اخلاقی رویوں کا بھی ذکر کرتے ہیں جو مسلم

تہذیب و ثقافت کا خاصہ تھے تاہم بد قسمتی سے مسلمان ان سے گریزاں نظر آتے ہیں البتہ اہل یورپ نے انھیں اپنالیا ہے۔ لکھتے ہیں:

> جب اس معاشرے سے اپنے معاشرے کا موازنہ کرتا تو ہیٹر کی گرمی کے ساتھ ساتھ رگوں میں افسردگی سی دوڑنے لگتی کہ مسلم دشمنی کے باوجود انگریز کی زندگی کی قدریں اسلام کے کتنے قریب ہیں اور ہمارے اسلامی نعروں کے باوجود ہمارے پیمانے ہر ہر قدم پر کیسے اسلام کی نفی کرتے ہیں۔[20]

وطن واپسی پر انہیں قوموں کی زندگی میں تعلیم کی اہمیت سے متعلق بہت کچھ جاننے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ انتہائی مختصر انداز میں ۱۹۷۰ء کے انتخابات کا ذکر کرنے کے بعد رپوتاژ مشرقی پاکستان کے دلسوز واقعات سے آگے بڑھتی ہے۔ بھولا جو اس سارے کرب کا حصہ تھا اُس بنگالی اکثریت میں شامل تھا جو پاکستانی تھی۔ مسعود مفتی اس کرب کو بیان کرتے ہیں کہ خانہ جنگی نے ہر شے کا حلیہ بدل دیا تھا۔ لوگ اس حد تک نفسیاتی دباؤ کا شکار تھے کہ وہ یہ بھی سمجھنے سے قاصر تھے کہ انہیں فوج مارے گی یا بنگالی۔ لکھتے ہیں کہ:

> پکڑ دھکڑ دار و گیر اور ضبط و آہ کا ایک حشر سا ہر طرف بپا تھا۔ مجھے بعض اوقات یوں لگتا کہ میں وقت کی الٹی زقند کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے غدر کے فوراً بعد کے زمانے میں پہنچ گیا ہوں۔[21]

مشرقی پاکستان میں گزرا ہوا وقت مسعود مفتی کے تجزیے کو براہ راست وہ ثبوت اور دلائل مہیا کر رہا تھا جو ان کو مغربی پاکستان میں ہوتے ہوئے شاید کبھی نصیب نہ ہوتے۔ خانہ جنگی ایک ایسی صورتحال کا نام ہے جس میں لوگوں کے اصلی چہرے کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اس سارے منظر میں جہاں بھولا اور اس جیسے بے پنا محب وطن بنگالی تھے وہیں ستار جیسے کردار بھی تھے جو علی الاعلان نہ سہی مگر در پردہ یہی چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان آزاد بنگلہ دیش کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر اُبھرے۔ باغی اقلیت اس قدر منہ زور تھی کہ محب وطن اکثریت دب کر رہ گئی تھی حکمرانوں کا غیر مصالحانہ رویہ بھی ان کی ہمتیں توڑنے میں پیش پیش تھا۔ فوجی کاروائی تو باغیوں کا سر کچلنے کے لیے تھی اگر اس کے بعد سیاسی سمجھوتے سے اقتدار کی منتقلی کی کوئی راہ نکلتی تو تاریخ کو وہ سب نہ دیکھنا پڑتا جس سے آج تک تاریخ کے اوراق داغدار ہیں۔ مسعود مفتی کہتے ہیں:

> فوجی کاروائی صرف بغاوت فرو کرنے کی حد تک جائز تھی۔ بغاوت بنگالی اقلیت نے کی تھی جو منہ زور تھی۔ جنرل یحییٰ کی ذاتی اور سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے منہ چڑھی تھی اور بیرونی امداد کی شہ پر ہر تعمیری مصالحت سے منہ جوڑ لیتی تھی۔ مگر بنگالی اکثریت باغی نہ تھی۔ محب وطن تھی اور محض خاموش تھی۔[22]

اس بات کا اندازہ تاریخ کی کتب سے لگایا جاسکتا ہے۔ فسادات کا بازار یقیناً بہت گرم تھا مگر ایسے کرداروں کو نظر انداز کر دینا تعصب کے زمرے میں آتا ہے کہ جو بنگالی تھے مگر متحدہ پاکستان میں رہنا چاہتے تھے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں ڈھاکہ کے پاکستانی کمشنر سید علمدار رضا کا انٹرویو شامل ہے۔ جنہوں نے ایک سوال کے جواب میں بتایا جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا مشرقی پاکستان میں اکثریت پاکستان کے خلاف ہو گئی تھی؟ کہتے ہیں کہ:

> دیکھیے میرا تجربہ اور مشاہدہ اس کے برعکس ہے وہ علیحدگی نہیں چاہتے تھے۔ بنگالی پر جوش ضرور تھا اور اپنے حق کے لیے لڑنے پر آمادہ بھی مگر علیحدگی نہیں چاہتا تھا۔ [۲۳]

بھولا چونکہ ایک ایسا محب وطن پاکستانی تھا جس پر زمانے کی دوڑ دھوپ نے بھی متحدہ پاکستان کی محبت کو کم نہ کیا تھا اس لیے وہ جہاں ممکن ہوتا یہ بات واضح کرنے کی کوشش کرتا کہ تمام بنگالی علیحدگی نہیں چاہتے تھے۔ بھولا مسعود مفتی سے گفتگو کے دوران کہنے لگا:

> ہمارا المیہ صرف یہی نہیں کہ یہ صوبہ ملک سے الگ ہو رہا ہے بلکہ اصل المیہ اس سے بھی بڑا ہے کہ مغربی پاکستان میں تم لوگ یہ سمجھتے ہو کہ ہم سب لوگ علیحدگی چاہتے ہیں۔ [۲۴]

ملک فوجی حکومت کے زیر اثر تھا کوئی ایسا نمائندہ نہ تھا جو ان مظلوم لوگوں کی بھی ترجمانی کرتا۔ انتخابات میں دھاندلی کے باوجود رجسٹرڈ ووٹوں کے صرف بیالیس فیصد ملے تھے جن میں پندرہ فیصدی ہندوؤں کے ووٹ تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مشرقی پاکستان کے صرف ۲۷ فیصد مسلمان مجیب الرحمٰن کے ساتھ تھے۔ مگر حالات اس قدر دگرگوں تھے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی بقا قائم رکھنے میں لگ گئے تھے کہ اگر وہ ملکی بقا کیلئے کھڑے ہو جاتے تو مکتی باہنی انہیں صفحہ ہستی سے بالکل ہی مٹا دیتی۔ بھولا ان تمام حالات کے بعد اپنی گفتگو میں سیاسی لیڈروں جنرل یحییٰ اور ان کے ٹولے کیلئے تماش بین کی علامت استعمال کرنے لگ گیا تھا۔ کیونکہ دراصل ان کی حیثیت عوام کو اشتعال دلا کر اس کے بعد تماش بین کی سی رہ گئی تھی۔ صفدر محمود اپنی کتاب پاکستان کیوں ٹوٹا؟ میں لکھتے ہیں کہ:

> ملک کی سیاسی فضا کسی غیر ملکی آئینی بحران کی نشاندہی کر رہی تھی مگر یحییٰ خان نے حالات کو سدھارنے کی کوشش نہ کی۔ [۲۵]

مسعود مفتی نے ایک ادیب اور سول سرونٹ کی حیثیت سے جہاں تک ممکن ہوا حقائق کو درست انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ بیوروکریسی سے وابستگی کی بنا پر عسکری حالات و واقعات کا بہت زیادہ اندازہ نہیں تھا مگر مصدقہ اطلاعات سے جہاں تک ممکن ہوا انہوں نے حالات و واقعات کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ سرکاری یا نیم

سرکاری اطلاعات میں سے بھی ان اطلاعات کو رپورٹ میں درج کیا جن کے متعلق ان کے پاس شواہد، دلائل اور براہ راست ثبوت موجود تھے۔ بحیثیت ادیب ان کی رپورٹ میں جذباتیت بھی ملتی ہے مگر یہ جذباتیت کہیں بھی حقائق پر حاوی نظر نہیں آتی ہے۔ سول سروس میں ہونے کی بنا پر فوج کے ساتھ ان کے وہ روابط نہ تھے جو ملکوں میں افواج اور بیوروکریسی کے درمیان ہوا کرتے ہیں۔

مارشل لاء کی وجہ سے باوردی، بے وردی کو قریب نہیں بھٹکنے دیتا تھا جس کے نتیجے میں ایک ایسا خلا پیدا ہو چکا تھا جس کو پُر کرنا کسی فرد واحد کا کام نہیں تھا۔ مارشل لاء انتظامیہ کیا کرتی تھی، سویلین اس سے بے خبر تھے۔ مغربی پاکستان سے بلوائے گئے افسران کو ایک عام آدمی کی طرح ہر خبر سے بے خبر رکھا جاتا تھا۔ بھولا ان تمام باتوں کا ادراک رکھتا تھا وہ بہت سے باشعور پاکستانیوں کی طرح حالات و واقعات کو نگاہ میں رکھے ہوئے تھا اور یہی عمل اس کیلئے انتہائی تکلیف کا باعث تھا۔ وہ اس کٹھ پتلی تماشے کا حصہ تھا جس کی ڈور حکمرانوں، سیاستدانوں اور فوج کے ہاتھ میں تھی۔ مسعود مفتی سے گفتگو کرتے ہوئے وہ درشتی سے اس بات کا اظہار کرنے لگا کہ:

> میں کیا جانتا نہیں کہ تم لوگ جو مغربی پاکستان سے ادھر لائے گئے ہو، محض تماشائی ہو، نہ پالیسی میں تمہارا دخل ہے نہ سوچ میں۔ اس سارے ڈرامے میں تم لوگ محض طاق کی سجاوٹ ہو، یہاں تو کرفیو بھی فوج کا ہیڈ کوارٹر لگاتا ہے اور سول انتظامیہ کو پتہ بھی نہیں ہوتا۔ تمہارے کالجوں سے پروفیسر گرفتار کر لیے جاتے ہیں اور تمہیں بعد میں پتہ چلتا ہے۔[۲۶]

بھولا جس ذہنی کرب کا شکار تھا اس کا کوئی مدلل جواب مسعود مفتی کے پاس نہ تھا۔ تاہم یہ کردار ایک علامت بن کر ایسے بہت سوں کی نمائندگی کر رہا تھا جو درحقیقت اندر سے ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ اربابِ اختیار ملک توڑنے میں مصروف تھے اور یہاں وفادار اور محب وطن انسانوں کے دلوں کا مرہم کون بنتا۔ مشرقی پاکستانیوں کی اکثریت کی طرح وہ بھی یہی سمجھتا تھا کہ اگر ملک کے اس حصے پر حملہ ہوا تو اس کا دفاع مغربی پاکستان کی طرف سے کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا کہنا ہے کہ:

> قوم اب تک ایک تھی اور ہر مشرقی پاکستانی خوشی کے ساتھ قوم اور وطن کے دفاع کے لیے اپنا سر کٹوا سکتا تھا تاہم اس جنگ کے بعد ان کا احساس محرومی مزید گہرا ہوتا چلا گیا کیوں کہ وہ یہ جان چکے تھے کہ کسی خطرے یا بحران کی صورت میں مغربی پاکستان ان کی مدد کو نہیں آئے گا اور انہیں اکیلے ہی اپنا دفاع کرنا پڑے گا۔[۲۷]

حملے میں تاخیر نہ صرف بھولا بلکہ بہت سے مشرقی پاکستانیوں کے دل میں سوال پیدا کر رہی تھی۔ جنگی محاذ کے حوالے سے درست لائحہ عمل کا بر وقت اطلاق نہیں کیا گیا تھا۔ دفاعی قوت کی کمی کا مسئلہ ایک طرف مگر جنگی حکمت عملیوں کا ضرورت کے وقت استعمال نہ کیا جانا بھی ہمیں شکست کی طرف دھکیلنے کی ایک اہم وجہ بنا تھا۔ اس سلسلے میں ہم اگر حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے نتائج دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سے عوامل کہیں انفرادی تو کہیں اجتماعی صورت میں اس شکست کے ذمہ دار تھے۔ نتائج میں درج ہے کہ:

> مغربی پاکستان کے جنگی محاذ کے حوالے سے بنائے گئے ماسٹر پلان میں بھی ایک بہت بڑی خامی نمایاں طور پر موجود تھی کہ اس میں واضح طریقے سے مشرقی پاکستان پر بھارتی حملے کے صحیح وقت کا کوئی تعین نہیں کیا گیا تھا۔ نہ ہی اس میں وضاحت کے ساتھ وہ حالات اور عوامل بیان کیے گئے تھے جو دشمن پر بڑے فوجی حملے کی غرض سے، کمانڈر انچیف کے علم میں لائے جانے ضروری تھے۔[۲۸]

یوں ایک فرد کی انفرادی ہچکچاہٹ کی وجہ سے یہ منصوبہ ناکام ہو گیا۔ مغربی پاکستان سے حملہ اسی دن کر دیا جاتا جس دن دشمن نے مشرقی پاکستان پر کھلم کھلا جارحیت کا ارتکاب کیا تھا تو تاریخ اس سے مختلف نتائج بھی پیش کر سکتی تھی جو آج اس کا حصہ ہیں۔ مسعود مفتی نے بھی عینی شاہد کی حیثیت سے اگرچہ مختصر مگر تاریخوں کی ترتیب کو مد نظر رکھتے ہوئے ان جنگی واقعات کو بھی پیش کیا جو ان کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے تھے۔ طیاروں کی لڑائی اور اس فضا میں بھولے کی گفتگو ایک ایسی تناؤ کی صورت حال کو جنم دیتی ہے جس سے اس وقت پورا بنگال دوچار تھا۔ بھولا سراپا سوال تھا کہ حملے کو اتنے دِن گزر گئے ہیں اور کٹھ پتلی حکمران سیکورٹی کونسل میں شکایت کیوں نہیں کرتے ہیں اور نہ ہی مغربی پاکستان سے حملہ ہوتا ہے۔ مغربی پاکستان سے حملہ تو ہوا مگر تاخیر سے یہاں بھی بھولے کا وجود سراپا سوال تھا کہ اِس قدر دیر سے حملے کا کیا فائدہ ہے۔

مسعود مفتی نے بھولے کے حقیقی کردار سے ہر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی بھی کوشش کی ہے جو کسی بھی محب وطن کو احتساب پر مجبور کرتا ہے۔ یہاں بھولا ان افواہوں کو بھی سوال بنا کر پیش کرتا تھا جو اس جنگ کو ایک مصنوعی جنگ بنا رہی تھیں۔ ایک نامہ نگار کا مراسلہ پڑھنے کے بعد جنگ کے متعلق کی گئی اس کی قیاس آرائیوں میں سے تیسری قیاس آرائی اس جنگ کو مصنوعی جنگ قرار دے رہی تھی۔ جنگی حالات جس رخ کی جانب جا رہے تھے وہاں یہ قیاس آرائی سچ ثابت ہونے جا رہی تھی۔ واقعات کے چناؤ میں مسعود مفتی نے جنگی حالات اور طیاروں کی لڑائی کے ان واقعات کو زیادہ بیان کیا جو انہوں نے اپنی رہائش گاہ کے کمرے سے براہ راست دیکھے۔ یوں ایک عینی شاہد کی حیثیت سے حالات و واقعات اور جذبات و احساسات کا مجموعہ جنگ کی مکمل تصویر کشی کر رہا تھا۔ لکھتے ہیں:

ایئرپورٹ پر جارحانہ لپکتے جھپٹتے ہندوستانی ہوائی جہاز نیچے سے دفاعی توپوں کی چنگھاڑ، فضا میں گوناگوں دھماکے کمرے میں دل گرفتہ لوگوں کا ہجوم، دلوں کی متضاد وابستگی، یہ تمام کوائف مل کر علامتی انداز میں برعظیم کی صورتحال کی مکمل تصویر کشی پیش کرتے تھے۔[29]

جنگی حالات کی مختصر تصویر کشی نہایت واضح اور صاف انداز میں کی گئی ہے۔ زیادہ تر ان واقعات کو مدنظر رکھا گیا جن سے مسعود مفتی براہ راست متاثر ہوئے تھے اور جن کا تعلق بیرونی و اندرونی انتشار کو واضح کرتا ہے۔ خانہ جنگی کے بعد انہوں نے ان واقعات کو بھی مختصراً شامل کیا جو ایک قیدی کی حیثیت سے انہیں برداشت کرنا پڑے۔ قید کی خاموش راتیں مسلسل سوال بن کر ستاتیں تو مسعود مفتی ان کے جوابات ڈھونڈنے کیلئے تاریخ کنگھالتے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح بیرکوں میں ڈالے گئے قیدی نفسیاتی اور جسمانی اذیتوں سے گزر رہے تھے۔ مسلسل شرمساری میں غرق یہ قوم حادثوں کی داستان لیے بیٹھی تھی۔ جس میں مسلسل چار نسلوں سے جاگیردارانہ رویے پختہ ہو چکے تھے۔ بھارت نے جاگیریں اور ریاستیں ختم کر دیں اور جمہوریت چل پڑی مگر پاکستان میں اقتدار کے جھولے میں کئی برسوں سے جاگیر دار بیٹھے تھے۔ ہندو بہت چالباز تھا۔ جغرافیائی تقسیم کے بعد بھی چین سے نہیں بیٹھا تھا۔ پاکستانی قیدیوں کو نفسیاتی طور پر اذیت دے کر خوشی محسوس کرتا۔ قید میں ہندوستانی زعما آتے اور ہندو مسلم اتحاد اور دو قومی نظریے کی تردید کرنے کی کوشش کرتے مگر جواب میں پاکستانی قیدیوں کے چبھتے ہوئے سوالات سن کر واپس چل دیتے۔ ہندوستان کے آرمی ہیڈ کوارٹر کی لائبریری سے پروپیگنڈا والی کتابیں بھی پاکستانی قیدیوں کیلئے بھیجی جاتی تھیں۔ یعنی ہندو نے اپنے وار اور سازشیں قیدیوں پر بھی مسلسل جاری رکھیں۔ یہ ہندو قومیت کا بہت پرانا حربہ تھا کہ وہ کتاب کے ذریعے مسلم امہ کو تقسیم کرا دیں۔ بنگلہ دیش کی تقسیم کے بعد کے حالات اس سے قبل کے حالات سے زیادہ خراب تھے ہندو تمام سامان لوٹ کر لے گئے۔ ملک ٹوٹ چکا تھا اور رہی سہی کسر ہندوؤں نے معیشت لوٹ کر پوری کر لی تھی اور یوں ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ گئی۔ مسعود مفتی ایک کالم کا اقتباس نقل کرتے ہیں کہ:

مصنف رقم طراز تھا کہ میں ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر پہنچا تو وہاں کوئی ٹیکسی نہ تھی۔ بصد مشکل ایک رکشہ لے کر ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کی طرف چلا۔ راستے میں رکشے والے سے پوچھا کہ یہاں ٹیکسیاں کیوں نہیں ہوتی ہیں تو وہ تلخی سے کہنے لگا اس لیے کہ ساری کاریں آپ لوگ اُٹھا کر ہندوستان لے گئے ہیں۔[30]

یہ اور اس جیسی بہت ساری مثالیں بنگلہ دیش میں بکھری پڑی تھیں جہاں تاریخ نوحہ کناں تھی کہ ملک توڑنے والے کیا ہوئے۔ صدر یحییٰ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جاتی تو جواب ملتا وہ مصروف ہیں۔ ان قیامت

خیز لمحوں میں بھی اقتدار اعلیٰ کے ضامنوں نے ملک کی پرواہ نہ کی۔ جنرل نیازی اپنی کتاب میں نسے ہتھیار کیوں ڈالے میں لکھتے ہیں کہ:

> میں بار بار انہیں پیغام بھیج رہا تھا۔ بار بار یحییٰ خان سے بات کرنے کی کوشش کرتا لیکن حمید یا گل حسن ملتے اور کہتے کہ یحییٰ خان باتھ روم میں ہے۔۔۔۔ چنانچہ میں نے جل کر کہا کہ ایک گھنٹے سے وہ باتھ روم میں ہے اسے کہو مجھ سے بات کرے۔[۳۱]

یہ ایک لاپرواہی نہیں تھی ہر سطح پر بہت سی کوتاہیاں کی گئی تھیں جنہوں نے مل کر شکست کی طرف دھکیل دیا تھا۔ بطور سیکٹری تعلیم مسعود مفتی نے ان سب حقائق کو بہت قریب سے دیکھا کہ کس طرح ہندو اساتذہ اور نصاب نے مل اس باغی نسل کو پروان چڑھایا۔ یہاں ہمارے نظام تعلیم کی وہ کوتاہیاں سر فہرست ہیں جن کا سدِباب نہیں کیا گیا اور نتیجہ ایسے اشتعال کی صورت میں سامنے آیا کہ جس کو قابو کرنا ناممکن تھا۔ یہ وہی ملک تھا جس میں کوریا کا وفد یہ دیکھنے آیا تھا کہ پاکستان اس قدر تیزی سے ترقی کیسے کر رہا ہے اور اب یہی پاکستان تھا کہ جس کے فرسودہ تعلیمی نظام نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ اس سلسلے میں انہیں براہ راست مدرسہ عالیہ دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا مگر ان کے اندر چھپا حساس ادیب کئی دن تک اس بات پر کڑھتا رہا کہ دنیا کے نظام تعلیم میں کس قدر جدت آچکی ہے اور ہم ابھی تک فرسودہ نظام تعلیم کو لے کر چل رہے ہیں جسے جدید اور عصری تقاضوں کے مطابق نہیں ڈھالا جاسکا۔ جس قوم میں ۲۴ سال تک ۹۰ فیصد اساتذہ ہندو ہوں اور نصاب کلکتہ سے بن کر آتا ہو۔ جس میں ہندو کلچر اور رسومات کو ترویج دی گئی ہو اور مسلمانوں کے نام خال خال ہوں اس قوم سے کیا گلہ۔ گلہ تو اس سے پچھلی نسل سے تھا جو پاکستان بنا کر بھول گئے تھے کہ اس کی حفاظت کیسے کرنا ہے۔ ان حالات میں ایسے چہروں کا سامنے آنا جو پاکستانی ہو کر متحدہ پاکستان نہیں چاہتے تھے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ مسعود مفتی لکھتے ہیں:

> وہ تیس سالہ نوجوان افسر تھا اور میرے ماتحت کام کرتا تھا۔۔۔ گفتگو میں بے باک مگر لہجے میں مودب غیر بنگالی مسلمان سے متنفر، مگر بنگالی ہندو کا گرویدہ۔۔۔۔ اپنے کلچر کی جڑیں محمد بن قاسم کی بجائے منو سمرتی میں ڈھونڈنے والا معاشرتی اقدار پر مٹی کے رشتے کو ترجیح دینے والا قائد اعظم کا ذکر پر معنی خیز خاموشی اختیار کرنے والا۔[۳۲]

یوں نظام تعلیم، حکمرانوں کی خاموشی، اقتدار کی ہوس، سیاستدانوں کی کھینچا تانی، بیرونی طاقتوں کا عمل دخل ان سب نے مل کر ملک کو دولخت کر ڈالا اور تاریخ کا اک ایسا سانحہ رونما ہوا جو بھولے کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگا مگر وہ صرف بھولے کا غم نہیں تھا اس جیسے کئی انسانوں کا غم ایسے محب وطن پاکستانیوں کا غم تھا جو چاہ کر بھی کچھ نہ

کر سکے تھے۔ یوں تاریخ نے اک ایسا سبق دیا جو وقتی طور پر یاد رہا اور پھر بھلا دیا گیا۔ فوجی آمریت نے جمہوریت کا قصہ تمام کر دیا اور انصاف منہ دیکھتا رہ گیا۔ ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء کے نوائے وقت اخبار میں سینیٹر فرحت اللہ بابر ایک سوال کے جواب میں کہتے ہیں کہ:

> سانحہ مشرقی پاکستان کا سب سے بڑا سبق یہ ہے کہ فوجی آمریت جمہوریت کی نفی کرتی ہے جس کا نتیجہ ملک کے دولخت ہونے کی صورت میں نکلا۔ جب غیر ضروری مداخلت کا سلسلہ دراز ہونے لگا تو سیاسی افراتفری پیدا ہونا فطری امر ہوتا ہے۔ [۳۳]

یوں یہ رپوتاژ جو بھولے کے انفرادی المیے سے شروع ہوا پوری قوم کے المیے کے ساتھ بھولے کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ بھولا اس ایک شکست کو ہی دیکھ سکا شاید اس میں اس سے زیادہ دیکھنے کی سکت نہیں تھی اسی لیے سرطان جیسے موذی مرض کے کا شکار ہو کر چل بسا۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک سرطان اس ملک کو بھی کھائے جا رہا ہے۔ جاگیرداروں اور فوجی آمریت کے سرطان کے ہوتے ہوئے صرف آگاہی کی امید ہی واحد سہارا ہے جس کی بنیاد پر ملک کی بقا ممکن ہے۔

مسعود مفتی کی تحریر چہرے جس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۹۴ء میں اختتامیہ کے عنوان سے اس میں پہلا اضافہ کیا گیا جس میں قید سے واپسی کے متعلق معلومات اور تصاویر شامل کی گئیں۔ اس رپوتاژ کو مکمل ہونے کے لیے اِن حقائق اور سوالات کے جواب درکار تھے جو ۱۹۷۱ء کے بعد مسعود مفتی اور خود پاکستانی قوم کے ذہن میں مچل رہے تھے اور اس کے تشفی بھرے جوابات حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے منظر عام پر آنے کی صورت میں مہیا کر دیے گئے۔ ۱۶ دسمبر ۱۹۹۶ء کو روزنامہ ڈان میں چھپنے والا مضمون بھی اس کتاب کے ایک حصے مہرے میں شامل ہے۔ یوں چہرے اور مہرے کے عنوان سے یہ اضافہ شدہ ایڈیشن جس میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی سفارشات اور نتائج کو بھی شامل کیا گیا ہے جو دسمبر ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ کل پانچ دنوں ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ء سے ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء تک کے دنوں کی الم ناک داستان ہے جس کے اضافہ شدہ حصے میں تصاویر، جوابات اور حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی سفارشات اور نتائج شامل ہیں جن سے قاری کو اندازہ ہوتا ہے کہ متحدہ پاکستان نے کس طرح اپنی آخری سانسیں لیں اور اس کو توڑنے میں کون سے عوامل کار فرما تھے۔

بطور سول سرونٹ مسعود مفتی نے اپنی آنکھوں سے جن واقعات کو دیکھا اور جن چہروں کا مشاہدہ کیا ان کی مختصر مگر حقائق و دلائل پر مبنی داستانِ الم اس رپوتاژ کا حصہ ہے۔ رپوتاژ کے پہلے حصے میں وہ واقعات شامل ہیں جن

کے مسعود مفتی براہ راست شاہد ہیں۔ اپنی دیگر غیر افسانوی نثر کی طرح اس میں بھی انہوں نے حقائق کو مدلل انداز میں مختصراً پیش کرنے کی کوشش کی ہے مگر تمام تر ادبی لوازمات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ واقعات سیاسی، جنگی اور ذاتی مشاہدے پر مبنی ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار کسی حد تک جذباتیت مگر مدلل انداز میں کرتے ہیں۔ ایک ادیب کی حیثیت سے انہوں نے جس حساس انداز میں واقعات کو محسوس کیا انہیں بغیر کسی لگی لپٹی کے نہایت واضح انداز میں بیان کر دیا۔

مسعود مفتی کی تحریر چہرے اور مہرے کے پہلے حصے چہرے کی ابتداء ہوائل انٹر کانٹی نینٹل کی سب سے اوپر والی منزک کے کمرہ نمبر ۱۱۰۸ سے ہوتا ہے جس کی کھڑکی سے جنگ کے مناظر دیکھے جاسکتے ہیں اور جس ہوٹل کے اندر بے پناہ اور مختلف چہروں کو جانچا جاسکتا ہے۔ یہاں مسعود مفتی نے چار قسم کے چہروں کا ذکر کیا اور ان قسموں میں شامل چہروں کا بغور جائزہ لیا۔ وہ صرف جائزہ لینے پر اکتفا نہیں کرتے ہیں بلکہ گفتگو کے ذریعے ان کے تاثرات بھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں متحدہ پاکستان اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ مسعود مفتی اگرچہ ایک بیوروکریٹ تھے مگر اس وقت صرف ایک دردمند اور محب وطن پاکستانی تھے۔ وہ اپنے ملک کو ٹوٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پہلی قسم کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ غیر ملکی چہرے ہیں جو نامہ نگار، اخبار نویس اور تاجر کا نقاب اوڑھے ہیں مگر جتنا ناقابل تلافی نقصان وہ اس ملک کو پہنچا چکے ہیں اس کا ازالہ اب ممکن نہیں تھا۔ یہاں وہ اس بے بس ادیب کے روپ میں تھے جو سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی دنیا کو یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ چہرے ان بھیانک نقابوں کے پیچھے کیا مقاصد لیے آئے ہیں لکھتے ہیں:

> یہ چہرے اس چمن کی آبیاری کرنے کے روپ میں آتے تھے مگر نہایت مہارت سے بیخ کنی کر رہے تھے اور اب ہماری خزاں کو اپنی بہار بنا رہے ہیں۔ اس وقت میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز ان چہروں کا تاثر ہے جو قلم کی گرفت میں نہیں آسکتا۔ [۳۴]

دوسری قسم ان چہروں کی ہے جو مغربی پاکستان سے تھے اور جن میں سرکاری ملازمین، پی آئی اے کا سٹاف اور پرائیویٹ کمپنیوں کے ملازمین شامل تھے۔ یہ چہرے گزرے دنوں کے دردناک واقعات اور مستقبل کی بے یقین کشتی کے درمیان ڈول رہے ہیں۔ جو اس سانحے میں کسی معجزے کے انتظار میں ہیں مگر جانتے ہیں کہ تاریخ کا اونٹ شکست کی کروٹ بیٹھنے جا رہا ہے۔ تیسری قسم مشرقی پاکستان کے لوگوں کی ہے یہ ان بنگالیوں کے چہرے ہیں جو پاکستان کی کشتی بچانے کے لیے خود ڈوب کر آگئے تھے جنہیں ہندوستانی فوج اور مکتی باہنی بھی متحدہ پاکستان کے لیے

لڑنے سے باز نہیں رکھ سکی۔ ایک ایسے ہی بنگالی سے گفتگو کرتے ہوئے مسعود مفتی کہتے ہیں کہ وہ بہت ذمہ دار اور سمجھدار بنگالی تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگا:

> ہم نے اپنے ملک کو آئیڈیولوجیکل ملک کہا اور سیکولر انداز میں چلایا۔ ہندوستان نے اپنے ملک کو سیکولر کہا اور آئیڈیولوجیکل انداز میں چلایا۔ منافق وہ بھی تھے، منافق ہم بھی تھے مگر وہ ہم سے بھی بہتر منافق نکلے۔[۳۵]

چوتھی قسم ان بہاری لوگوں کی تھی جو ۱۹۴۷ء میں بہار، آسام، یوپی اور سی پی سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آئے اور دوسرے درجے کے شہری بن گئے۔ ان چاروں قسم کے چہروں میں یہ چہرے سب سے زیادہ مظلوم تھے کیوں کہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں، ۱۹۷۱ء کے فسادات اور اب دسمبر کی تباہی سب میں یہ قوم بری طرح پسی تھی۔ ہر دفعہ خون کی ہولی ان کے حصے میں آئی مگر کوئی شناخت یا زمین کا ٹکڑا نصیب نہ ہوا جس کو یہ اپنی جگہ کہتے۔ یہ وہ تمام چہرے ہیں جو ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں مفتی صاحب کے ارد گرد موجود ہیں اور وہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر ان کا جائزہ لے رہے ہیں۔ وہ وقت کو قلم کی طاقت سے محفوظ کر رہے ہیں۔ پہلی قسم کے علاوہ باقی تینوں قسم کے چہروں میں ملک کے ٹوٹنے کا احساس زیاں مشترک ہے۔ یہاں مسعود مفتی آتے جاتے بہت سے چہروں کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کرتے اور اپنے تجزیے کے مطابق ان کا احوال بیان کر دیتے ہیں۔ مگر ان تمام حالات میں بھی وہ احتساب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں ایک اچھے ادیب اور محتسب کی طرح بحیثیت قوم یہ جاننے کی کوشش میں لگے رہے کہ ہم نے کہاں کہاں کو تاہیاں کیں۔ یہاں انہوں نے کسی ایک نقطے کو بیان نہیں کیا بلکہ ان تمام سیاسی، سماجی، معاشی، معاشرتی اور ذاتی خامیوں کو مد نظر رکھا ہے جو کسی بھی زاویے سے ملک کے ٹوٹنے میں معاون تھیں۔

ایک مغربی پاکستانی کی حیثیت سے وہ جن حالات کا مشرقی پاکستان میں جائزہ لے رہے تھے ان جیسے بہت سے مغربی پاکستانیوں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ ملک کے اس حصے میں کیا قیامت بپا ہے۔ مگر انہیں خبر بھی کیسے ہوتی ہمارے قومی رویوں نے ہمیں ہمیشہ حالات سے بے خبر رکھا یا واقعات کا وہ رخ پیش کیا جو سچائی سے کوسوں دور تھا۔ غیر ملکی طاقتیں اپنی کامیابی کا جشن منا رہی تھیں اور ہم کھڑے ملک کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھتے رہے۔ یہ وہ المیہ تھا جو مسعود مفتی کے قلم سے خون کے آنسوؤں کی صورت میں صفحات پر اتر رہا تھا۔ لکھتے ہیں کہ:

> اس آگ کے لگانے میں سب سے اہم کردار ہمارے گھر کے چراغوں نے کیا ہے۔ غیروں نے تو فقط ہماری پیدا کردہ صورتحال سے فائدہ اُٹھایا ہے اور اب دور کھڑے اس دردناک آپریشن کو دیکھ رہے ہیں جس میں ایک حصہ کاٹا جا رہا ہے۔[۳۶]

آس اور امید لگائے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں بہت سے چہرے گھوم رہے تھے۔ مسعود مفتی ایک پاکستانی کی حیثیت سے انہی لوگوں کی فہرست میں شامل تھے جو یہ خبر سننے کے انتظار میں تھے کہ پاکستانی فوج نے ہندوستانی فوج پر غلبہ پالیا ہے۔ مگر صرف مصلحت کے آسرے پر زندہ رہنے والی قوموں کا یہی حال ہوتا ہے جو اس وقت ہمارا تھا۔ وہ تاریخ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ایک مسلسل احتسابی عمل سے گزر رہے تھے۔ پھر وہ دردناک خبر بھی سننے کو ملی جس سے کب سے نظریں چرانا چاہ رہے تھے۔ وقت نے اس دوراہے پر لا کھڑا کیا جہاں سے واپسی ممکن نہ تھی۔ ایک ادیب ان لمحوں کو الفاظ میں قید کر بھی لے تو ان جذبات کی عکاسی پھر بھی ممکن نہ تھی جو شکست خوردہ قوم رکھتی ہے۔ اس تمام المیے سے براہ راست وابستگی ان کے جذبات کو وہ درد عطا کر گئی تھی کہ آج بھی قاری ان لمحوں کی کیفیت پڑھ کر آنکھ نم کیے بنا نہیں رہ سکتا ہے۔ مسعود مفتی اس لمحے کو الفاظ میں سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> اب ہم بنگلہ دیش میں بیٹھے ہیں۔۔۔۔ ہماری حسیات مفلوج ہیں۔ پاؤں تلے زمیں محسوس نہیں ہوتی۔ سر پر چھت نظر نہیں آتی دیواریں کہیں غائب ہو گئی ہیں۔۔۔۔ یوں لگتا ہے کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے نہ جہاں نہ جان، نہ آس نہ احساس۔ پاکستانی جھنڈے کے چاند تارے یہاں کیا ڈوبے۔ کائنات کے مہ و انجم ہی ڈوب گئے۔ [۳۷]

ملک ٹوٹ چکا تھا اور محب وطن پاکستانی اس صدمے کو برداشت نہیں کر پا رہے تھے۔ ان کے ذہن سراپا سوال تھے۔ احتساب کا وقت آن پہنچا تھا۔ اب باقاعدہ طور پر ہتھیار ڈالے جانے تھے۔ اپنی فوج کی اس سے زیادہ تذلیل کیا ہو سکتی تھی۔ یہاں مسعود مفتی یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ ہم بحیثیت قوم اس قدر بزدل کیوں ہو گئے۔ مگر وقت اور واقعات ہر شے کو واضح کر دیا کرتے ہیں اور آج احتساب کے آئینے میں سب کچھ واضح تھا۔ یحییٰ خان کا انتقالِ اقتدار کا وعدہ پورا ہو چکا تھا بس انداز ذرا مختلف تھا۔ پہلی قسم کے چہرے خوش جبکہ باقی تین قسم کے چہرے ایسی زمین میں دھنس گئے تھے جہاں وہ زندہ لاشوں کی حیثیت سے موجود تھے۔ مسعود مفتی ایسے واقعات کا چناؤ کرتے ہیں جن کا براہ راست تعلق اس المیے سے تھا۔ اس لیے اس میں سیاسی، سماجی، تہذیبی، تخریبی، مذہبی اور ذاتی نوعیت کے وہ واقعات شامل ہوتے جاتے ہیں جو سقوط ڈھاکہ کے سانحے میں میں کسی بھی موڑ پر پیش آئے تھے۔ سب کچھ یحییٰ خان کی مرضی سے ہو رہا تھا مگر ویڈیو پر اس سے قبل کوئی خبر نہیں دی گئی تھی۔ حکمران، سیاستدان اور فوجی حکمران وہ کردار تھے جن کا گٹھ جوڑ اس ملک کو لے ڈوبا تھا۔ جنرل یحییٰ نے ایک حکمران کی حیثیت سے جتنے بھی فیصلے لیے وہ یا ان کے ذاتی تھے یا فوجی افسروں کے مشوروں کا نتیجہ تھے مگر ان سے جو ناقابل تلافی نقصان ہوا وہ ساری قوم کے حصے میں آیا۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ اس سلسلے میں کہتی ہے کہ:

یحییٰ خان نے ملک کو جنگ میں جھونک کر احمقانہ غلطی کی جس سے کسی اچھے نتیجے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی اور وہ محض اپنی ضد پر اڑے رہے کیوں کہ وہ ملک کی مشکل صورتحال کے سیاسی حل پر کسی قیمت رضامند نہیں تھے اور آخر کار قوم کیلئے باعث شرم ہتھیار ڈالنے کی ترغیب کی اجازت دی جس کی تاریخ اسلام میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ [۳۸]

مسعود مفتی سیاسی حالات وواقعات کے ساتھ تہذیبی تبدیلی کو بھی نگاہ میں رکھے ہوئے تھے۔ ہندو اور بنگلہ تہذیب میں جو مماثلت تھی اس سے قطع نظر ہتھیار ڈال دینے کے بعد کی تہذیبی تبدیلی خود ساختہ تھی۔ لکھتے ہیں کہ:

میں جانتا ہوں کہ بنگال میں ہندی کا رواج ہے مگر اس وقت اس چہرے کی ہندی رواج والی ہندی نہیں تھی یہ تو ایک سیاسی تبدیلی کی نقیب بن کر اُبھری تھی یہ تو ایک تہذیب کے ہاتھ پر دوسری تہذیب کے ماتھا ٹیکنے کا نشان ہے۔۔۔ جب مسلمان ماتھے پر خوشامد سے بندی چمکی تو پورا کلچر ہار مان گیا۔ کلچر کے اوراق تو صدیوں بعد اُلٹتے ہیں اور یہاں تین گھنٹوں میں ہی کایا پلٹ گئی۔ [۳۹]

یہ واقعہ جنگ بندی کے بعد کا تھا جب ایک مسلمان لڑکی بندی لگا کر گھوم رہی تھی۔ مسعود مفتی نے ان تمام حالات کا بغور جائزہ لیا تھا وہ جانتے تھے کہ یہ اچانک کی تبدیلی ہماری شکست کا منہ بولتا ثبوت تھی مگر احساس زیاں نے اس قدر مفلوج کر دیا تھا کہ کس پہلو کو چھوڑتے اور کس پر بات کرتے۔ ملک تو ٹوٹ چکا تھا۔ مگر نیا ملک حاصل کرنے والوں کے حوصلے اور جوش وہ نہیں تھا جو آزاد مملکت کا ہوا کرتا ہے البتہ فسادات کے وہ واقعات جو پہلے گھروں کے محدود تھے اب سرعام ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ ایک آزاد بنگلہ دیش کی خوشی کا اظہار تھا۔ مکتی باہنی ان رہے سہے مغربی پاکستانیوں اور بہاریوں کو بھی قبر کے اندر دیکھنا چاہتے تھے جو زمین کے اوپر تھے۔ غیر ملکی اخبار نویس بھی اس بربریت کے گواہ تھے جو سرعام سٹیج پر لوگوں کا قتل کر کے ڈھائی گئی تھی۔ ہم نے تاریخ کی وہ بدترین غلطیاں کی تھیں جن کا خمیازہ ہمیں اسی صورت میں بھگتنا تھا۔ ملک ڈوب گیا تھا اور اب ہم مفلوج ہو چکے تھے۔

اپنی کتاب کے حصے مہرے میں شامل مواد ان سوالوں اور جوابات کی طرف رجوع کرتا ہے جو ملک توڑنے میں پیش پیش تھے۔ بے پناہ ایسے سوالات موجود تھے جن کا مدلل جواب ہی انصاف تھا۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کو کئی سالوں تک صیغہ راز میں کیوں رکھا گیا تھا۔ تمام باتوں میں تین مرکزی کردار یحییٰ، بھٹو اور مجیب الرحمٰن ایک ایسا تکون کر بن سامنے آتے ہیں جن کی سازشیں عقل سے بالاتر ہیں۔ جن میں ہر وہ شخص جس کو

کسی بھی طرح اپنی گواہی پیش کرنے کا موقع ملا تو اس نے دوسرے پر کیچڑ اُچھالا اور اس کو غدار کہا۔ ذوالفقار علی بھٹو اپنی کتاب عظیم المیہ میں مجیب الرحمٰن کے متعلق لکھتے ہیں:

> جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے یاد ہے کہ عام انتخابات سے چند ماہ پہلے صدر کے پرنسپل سٹاف آفیسر لیفٹیننٹ جنرل پیرزادہ نے مجھ سے براہ راست پوچھا تھا۔ "مجیب کے عزائم کیا ہیں" میں نے بلا جھجک کہ دیا تھا "علیحدگی"۔ میں نے الیکشن کے بعد بھی کوشش کی کہ ایک پاکستان کی حدود میں سیاسی تصفیہ ہو جائے۔ مجھے علم تھا کہ ایسا نہ ہوا تو خون بہے گا اور قتل عام ہو گا۔[40]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انہیں اس بات کا پہلے سے علم تھا تو اس مسئلے کے سیاسی حل کے لیے انہوں نے کوشش کیوں نہیں کی۔ وہ ملک میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے مگر شاید ان تینوں کرداروں میں سے کوئی بھی متحدہ پاکستان نہیں چاہتا تھا۔ سب کی ذاتی ہوس نے ملک کو دولخت کر ڈالا۔ مسعود مفتی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ:

> یحییٰ اور بھٹو کا الحاق صرف اسی وجہ سے ممکن ہو سکا کہ دونوں کی ہوس اقتدار بڑی سنگدلی سے ہر غیر آئینی قبضے پر آمادہ اور تیار تھی۔ چنانچہ اقتدار کے دونوں بھوکوں نے مصنوعی جنگ میں بغیر کسی مؤثر مقابلے کے مشرقی پاکستان کا ترنوالہ ہندوستان کو ہڑپ کرنے دیا۔[41]

مسعود مفتی نے اپنے مضمون کے علاوہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا تعارف بنیادی رپورٹ کا خلاصہ اور سفارشات اور ضمنی رپورٹ جس میں نتائج شامل تھے کو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا وہ حصہ جو کتاب میں شامل کیا گیا ہے، ان تمام ممکنہ سوالات کے جوابات پیش کرتا ہے جو سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے مسعود مفتی نے پڑھنے والوں کے لیے چھوڑے ہیں۔ انتیس برس بعد منظر عام پر آنے والی اس رپورٹ نے بہت سے الزامات کی حقیقت سب کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے۔ اقتدار کی کھینچا تانی کا آغاز کہاں سے ہوا اور فوج نے کب سے سیاسی معاملات میں دخل اندازی کرتے ہوئے اپنی حدود سے تجاوز کرنا شروع کر دیا۔ فوج کی جنگی ناکامی میں کونسی حکمت عملی کارفرما تھی اور کیا افسرانِ بالا کا ذاتی کردار بھی اِس قابل تھا کہ اِس پر عام بات کی جا سکے۔ یہ اور اُس طرح کے بہت سے سوالوں کے جواب حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں ملتے ہیں۔ وہ اقتدار جو ایوب خان سے زبردستی منتقل کروایا گیا تھا۔ یحییٰ خان اس کے سربراہ اعلیٰ کی حیثیت سے ان تمام فیصلوں کے متعلق جواب دہ تھے جو انہوں نے اس کرسی پر بیٹھ کر کیے۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں بہت سے گواہوں کی شہادتوں سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ مئی تک حالات سنبھل چکے تھے اگر حکومت چاہتی تو سیاسی گفت وشنید سے کوئی قابل قبول حل نکال سکتی تھی مگر یہ

بھی نہ کیا گیا۔ ملک میں لگائے گئے مارشل لاء نے کسی سیاسی سرگرمی کو کھل کر نہ ہونے دیا نتیجتاً لوگوں نے بغاوت کی راہ اپنائی۔ مشرقی حصے کے حالات سے یکسر بے گانگی اس بات کا ثبوت تھی کہ حکومتی عہدیدار اس حصے کو مزید برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ناقص حکمت عملیوں سے جنگ اتنے برے انداز میں لڑی گئی کہ کوئی بھی اندازہ لگا سکتا تھا کہ وسائل کی کمی تھی ہی مگر عقل کی کمی اس سے کہیں بڑھ کر تھی۔ بالآخر تاریخ نے وہ شرمناک لمحات دیکھے جو آج بھی انہیں احتساب کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ سے نقل کیے گئے اقتباسات میں ہے کہ:

> ہمارے سامنے پیش ہونے والی جملہ شہادتوں سے ہم اس کے علاوہ کوئی اور نتیجہ اخذ ہی نہیں کر سکتے کہ جنرل یحییٰ خان اور ان کے قریبی ساتھیوں کا ہرگز کوئی ارادہ نہ تھا کہ وہ مارچ کے مذاکرات کو نتیجہ خیز بناتے اور کامیاب ہونے دیتے۔ وہ سیاسی اور عسکری صورتحال سے مکمل طور پر واقف تھے اور انہوں نے ٹھان رکھی تھی کہ وہ عوام کے نمائندوں کو اُس وقت یا مستقبل میں کبھی بھی اقتدار منتقل نہیں کریں گے۔[۴۲]

عسکری و سیاسی ناکامیوں کے ساتھ ساتھ ہم اس چیز سے منہ نہیں موڑ سکتے ہیں کہ کسی بھی ملک کی افواج کا کردار اس کو عالمی سطح پر بہت معتبر بناتا ہے مگر حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے نتائج اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ ہمارے کئی سینئر افسران ۱۹۵۸ء میں لگنے والے مارشل لاء کے بعد سے اخلاقی گراوٹ کا شکار ہوتے چلے گئے تھے اور ۱۹۶۹ء میں لگنے والے دوسرے مارشل لاء نے کمی پوری کر دی تھی۔ یحییٰ خان جو صدر پاکستان کے عہدے پر فائز تھے اور جنرل نیازی جو ایسٹرن کمانڈر تھے ان دونوں کے ساتھ ساتھ دیگر افسرانِ بالا بھی اخلاقی پستی کا شکار ہو چکے تھے جن سے ان کی عسکری قوتیں بہت متاثر ہوئیں اور مجموعی طور پر افواج کا مورال بھی اس سے متاثر ہوا۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں شامل ایک گواہ کا بیان تھا کہ:

> جنرل نیازی ناچنے والی لڑکیوں کے مکانوں پر اپنی گاڑی میں جاتے تھے جس پر تین ستارے لگے ہوئے تھے اور سرکاری جھنڈا بھی لگا ہوتا تھا۔[۴۳]

ہتھیار ڈالنے کی شرمناک حرکت کا ارتکاب سب کے سامنے کیا گیا۔ جنگ ہار جانے کے بعد جنرل نیازی ہندوستانی جنرل کا استقبال کرنے خود ائیر پورٹ گئے اس سے زیادہ بری شکست اور کیا تھی۔ عینی شاہدین کے مطابق جنگ کے آخری دنوں میں جنرل نیازی اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکے تھے۔ شکست کسی ایک شخص کے ذاتی کردار کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ وہ مجموعی اخلاقی، سیاسی، عسکری کوتاہیوں کا نتیجہ تھی جو بحیثیت قوم پاکستانیوں سے سرزد ہوئی تھیں اور

جن کا ازالہ آج بھی ممکن نہیں ہے۔ مسعود مفتی نے تینوں تحریروں میں سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے یہ واقعات اور جائزے پیش کیے جن کے براہ راست گواہ تھے اسی لیے بحیثیت بیوروکریٹ اور ادیب انہوں نے حقائق کو کسی حد تک جذباتی مگر مدلل انداز میں بیان کیا۔ سچ کو بیان کرنے میں عار محسوس نہ کی اور ایک انفرادی و اجتماعی احتساب کا عمل بھی ساتھ ساتھ جاری رکھا۔ مسعود مفتی نے جہاں مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج کے مظالم کے متعلق گفتگو کی وہیں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کے تناظر میں پاکستانی فوج کے مظالم کو بھی سامنے رکھا جو بنگالیوں کے مظالم کے نتیجہ میں کیے گئے تھے یہ ان کی غیر جانبدارانہ سوچ کی غمازی ہے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا کتاب میں شامل حصہ کہتا ہے کہ:

> مشرقی پاکستان کے متعلق ہمیں بار بار شہادت ملی ہے کہ پاکستانی فوج نے شر پسندوں کے شر کے تناسب سے کہیں زیادہ اور غیر ضروری طاقت کا استعمال کیا ہے۔ ہمارے ریکارڈ پر مغربی پاکستان سمیت بہت سے افسران کی کافی شہادتیں موجود ہیں کہ ہمارے بعض افسران اور جوان بے دریغ اور بلا امتیاز قتل و غارت، زنا بالجبر، آتش زنی اور لوٹ کے مرتکب ہوئے۔ اس لئے جنگی قیدیوں کی واپسی کے بعد معروضی اور مفصل تفتیش کرانا لازمی ہے تاکہ ظالموں اور اخلاق باختہ لوگوں کو قرار واقعی مل سکے۔[۴۴]

کتاب کا اختتام احتساب اور اس سے متعلق ایسے سوال پر ہوتا ہے جو ایک لمحے کو قاری کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ حقائق کب تک چھپائے جاتے رہیں گے اور ہم کب تک بے مقصد سوالات سے حقیقت کو چھپاتے رہیں۔ اجتہاد کا دروازہ بند کرنے کے بعد ہم نے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کو بھی کئی سال چھپائے رکھا اور پھر کئی سالوں سے اس پر عمل درآمد کے منتظر ہیں۔ جب تک قوم حکمرانوں اور وڈیرہ شاہی کلچر سے آزادی حاصل کر کے اپنی قسمت خود نہیں سنوارے گی تب تک ہم ایسی ہی شکست سے دوچار ہوتے رہیں گے۔

صدیق سالک جو اپنی مزاح نگاری کی وجہ سے بہت شہرت رکھتے ہیں ان کی ناول نگاری، تاریخی و سوانحی کتابیں بھی اردو ادب میں اپنا الگ مقام رکھتی ہیں۔ زیر بحث مقالہ میں ان کی تین سوانحی کتابیں سیلوٹ، ہمہ یاراں دوزخ اور میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا شامل ہیں۔ سیلوٹ ان کی فوجی ملازمت کی کہانی ہے۔ ہمہ یاراں دوزخ بھارتی قید و بند میں گزرے لمحات کی داستان غم ہے۔ میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا ان کی تیسری کتاب ہے۔ جو سقوط ڈھاکہ کے اسباب، واقعات، اثرات اور اُن کے تاثرات پر مبنی ہے۔ تینوں کتابوں کا جائزہ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے لیا جائے گا۔ صدیق سالک کی ان غیر افسانوی تصانیف میں ان کے ذاتی

تجربات، مشاہدات اور محسوسات کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ واقعات کا چناؤ کرتے ہوئے بھی ان کی تحریروں میں ان واقعات کو پیش کرنے پر زیادہ زور دیا گیا ہے جن کا تعلق براہ راست ان کے مشاہدے سے ہے۔ یوں یہ تحریریں حقائق سے پُر اور مدلل ہیں۔ ایک عینی شاہد کی حیثیت سے ان کی عسکری زندگی میں سقوط ڈھاکہ کا الم ناک سانحہ بہت اثر رکھتا ہے۔ ایک فوجی کی حیثیت سے ہندوستان میں جنگی قیدی بن کر رہنا کس قدر تکلیف دہ عمل تھا اس کا اندازہ ان کی تحریروں کو پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔

واقعات کو پیش کرتے ہوئے وہ جس مزاحیہ اور طنزیہ انداز کو اپناتے ہیں وہ ایک ایسا درد انگیز انداز ہے جو قاری کو پہلے ہنسنے اور پھر سوچنے پر اُکساتا ہے۔ یہاں افسانوی طرز لیے واقعات ایک کہانی کی صورت چلتے ہیں مگر اس کے حقیقی کردار قاری کو احساس دلاتے ہیں کہ سقوط ڈھاکہ کوئی داستانوی قصہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر ظہور احمد اعوان ہمہ یاراں دوزخ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> اس میں سچی روداد ہے لحہ بہ لحہ کہانی ہے۔ ہنگامی واقعات ہیں۔ آنکھوں دیکھا حال ہے۔ سچے کردار اور مکالمے ہیں۔ خارجی مناظر، داخلی کیفیات ہیں، قہقہے، مسکراہٹیں، حرکت، سفر، خوف، درد، چیخیں ہیں۔۔۔۔۔ مصنف اس تحریر کا مرکزی کردار ہے اس میں تاریخیں، مہینے، سال، گھنٹے، منٹ تک گنوائے گئے ہیں۔ کتاب سچے ٹریجک واقعات کی رپورٹنگ ہونے کے باوجود ادبی حسن کاری سے بے نیاز نہیں۔[۴۵]

ان کی تحریروں میں مرکزی کردار خود صدیق سالک کا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ دیگر جن کرداروں کا ذکر کرتے ہیں وہ بھی اسی منظر کا حصہ تھے۔ بعض واقعات سیاسی و عسکری زندگی کے نمایاں کردار تھے اور بہت سے کردار دورانِ قید کے ہیں۔ ان تمام کرداروں کو ساتھ لے کر چلتی ان کی تصانیف ایک زبانی تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتی ہیں۔ جن میں حتی الامکان کوشش کی گئی ہے کہ واقعات کی پیش کش اسی ترتیب سے ہو جس طرح وہ پیش آئے ہیں۔ صدیق سالک اپنے جذبات کا اظہار بھی ساتھ ساتھ کرتے ہیں جن سے حالات واقعات کے متعلق ان کی رائے کا اندازہ ہوتا ہے۔ داخل اور خارج کے حسین امتزاج سے وہ ساری تفصیل اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ قاری نہ صرف سقوط ڈھاکہ کے دوران پیش آنے والے واقعات سے واقفیت حاصل کرتا ہے بلکہ بطور فوجی افسر صدیق سالک کی رائے سے متعلق بھی آگاہ ہوتا ہے۔ یوں اس تمام منظر نامے میں ان کی رائے سے یہ معلوم کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ بطور فوجی انہوں نے اس تمام واقعے کو کیسے محسوس کیا اور وہ اس میں کن کن کرداروں (سیاسی و عسکری) کو قصور وار تصور کرتے ہیں۔ ادبی زبان و بیاں اور شاعرانہ محاسن کو مد نظر رکھتے ہوئے انہوں نے ان تحریروں کو سقوط ڈھاکہ

کے حوالے سے بہت اہم کتب کی فہرست میں شامل کر دیا ہے۔ جن کو پڑھ کر قاری اس وقت کے متعلق کسی حد تک اندازہ لگا سکتا ہے۔ فنی و فکری لوازمات سے بھرپور سقوط ڈھاکہ کی معنویت کو بیان کرتیں یہ تصانیف فوجی افسران کے ادب میں بھی اپنا الگ اور نمایاں مقام رکھتی ہیں۔

ہمہ یاراں دوزخ صدیق سالک کی اولین کتاب ہے جو ۱۹۷۴ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ ان کی بطور جنگی قیدی، بھارت کی اسیری کی داستان ہے۔ زنداں اور قید میں کاٹی اس زندگی میں ذاتی تجربات، واقعات اور احساسات، تاریخی واقعات کے ساتھ جوڑ کر پیش کیے گئے ہیں۔ ہمہ یاراں دوزخ میں صدیق سالک کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ وہ مزاح کے پردے میں ان الم ناک واقعات کو بھی پیش کر جاتے جو ان کی عسکری زندگی کے سب سے دردناک دنوں کی سرگزشت ہے۔ اس میں قید و بند کی صعوبتوں کے ساتھ ساتھ دوستوں کے ساتھ گزارے وہ لمحات بھی ہیں جو حسین یادیں بنتے ہیں۔ داخلی و خارجی واقعات سے مزین یہ کتاب ان کی وارداتِ قلبی کا واضع اظہار ہے۔ بحیثیت پاکستانی اور فوجی سب سے شرم ناک وہ لمحات تھے جو تاریخ میں ہتھیار ڈالنے کی رسم کے طور پر محفوظ کیے گئے ہیں۔ ملک بکھر چکا تھا اور مکتی باہنی کی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ انسانوں کا قتل عام کیا جا رہا تھا جس میں مغربی پاکستانی اور بہاری سرفہرست تھے۔ بہاریوں کے حصے میں ایک بار پھر قتل عام آیا تھا۔ وہ جو کب سے اپنی شناخت تلاش کر رہے تھے اور **مہاجر** کے نام سے جانے جاتے تھے ایک بار پھر بے سرو سامان ہو گئے تھے۔ صدیق سالک کہتے ہیں کہ:

> بعض اضلاع میں پاکستان سے وفا کرنے والوں کو گاڑیوں کے پیچھے باندھ کر سڑکوں اور گلیوں میں گھسیٹا گیا۔ ان کی ٹانگیں جیپوں سے باندھ کر انہیں چیر دیا گیا۔۔۔۔ جس ہتھیار بند بنگالی کا دِل چاہتا ان کی جان، مال اور عزت سے کھیل جاتا۔ وہ جاتے تو کہاں جاتے! انکی پاسبانی کرنے والی پاک فوج خود ذلت کے بندھن میں اسیر تھی۔[۴۶]

بھارت نے اپنا کردار صرف پاکستان بننے سے پہلے یا اس کے ٹوٹنے تک ادا نہیں کیا تھا بلکہ وہ ان سازشی سرگرمیوں میں ہمہ وقت فعال تھا۔ بنگلہ دیش بنانے والوں کو ایک سال بعد نظر آیا تھا کہ بھارت کی انتہا پسندی انھیں تخلیقِ پاکستان کے پہلے دن سے لے کر اس الم ناک سانحے تک کس حد تک لوٹ مار کا نشانہ بنا چکی تھی۔ یہ لوٹ مار نفسیاتی، جسمانی، سیاسی اور معاشی ہر سطح پر تھی۔ صدیق سالک نے جابجا اپنی تحریر میں بھارت کا مکروہ چہرہ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ جنگ بندی کے ساتھ ہی بھارت نے نوزائیدہ بنگلہ دیش سے ساز و سامان کی منتقلی شروع کر دی تھی۔

جو جتنی طاقت اور ہوس رکھتا تھا اس نے اسی قدر لوٹا۔ صدیق سالک جرنیلوں کے بنگلوں کے پاس سے گزرتے ہوئے دیکھا گیا ایک منظر کچھ اس طرح پیش کرتے ہیں:

> کیا دیکھتا ہوں کہ ایک بھارتی جے۔ سی۔ او ایک فوجی ٹرک میں فریج، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ائیر کنڈیشنر لاد رہا ہے۔ ٹرک کا پیٹ بھر جاتا ہے مگر بھارتی جے۔ سی۔ او کا پیٹ نہیں بھرتا۔ وہ دوسرا ٹرک بھروانا شروع کر دیتا ہے۔[47]

بھارت کا یہ رویہ صرف جرنیلوں کا ساز و سامان اور غیر بنگالیوں کے اثاثے لوٹنے تک محدود نہیں تھا بلکہ ایک جنگی قیدی کی حیثیت سے بھی انہیں ایسے بہت سے معاشرتی رویے دیکھنے کو ملے تھے جو بھارت کے ساتھ ان کی نفرت میں اضافہ کرنے کا سبب بنے تھے۔ صدیق سالک بطور قیدی ان تمام رویوں کو جس انداز میں دیکھتے ہیں اس میں نفرت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ جیسے لکھتے ہیں:

> بھارتی میزبان ہو تو سمجھ لیجئے مطلب بر آری کے درپے ہے اور مادی منفعت اس کی کمزوری ہے۔ کوئی کمبل پر بک جاتا ہے۔ کوئی گھڑی پر اور کوئی ٹرانزسٹر پر۔ بھارتی سینا بکاؤ مال ہے، کوئی ہے خریدار؟۔[48]

ایک جنگی قیدی جو اپنے ملک میں افسرانہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی گزارتے گزارتے اچانک ازلی دشمن کے ملک میں قیدی کی حیثیت سے پہنچ جائے اس کی نفسیاتی حالت اسے مجبور کر دیتی ہے کہ وہ ہر شے کو ناقدانہ انداز میں دیکھنے لگ جاتا ہے۔ اگر وہی قیدی ایک ادیب بھی ہو تو اس کی تحریر میں کسی حد تک جانبداری بھی ممکن ہوتی ہے۔ صدیق سالک کی عسکری زندگی سے وابستگی اور پھر ہندوستان میں بطور جنگی قیدی یہ دونوں مختلف اور بالکل متضاد حیثیتیں تھیں جو کسی بھی افسر کو ہلا دینے کے لیے کافی تھیں۔ بھارت کے گلی کوچے ہوں یا ان میں بسنے والے انسان وہ سب صدیق سالک کے قلم سے بچ نہیں پائے۔ انہوں نے ہر شے کا نقشہ اس انداز سے پیش کیا کہ کوئی بھی قاری اس صورتحال سے ہندوستان کے متعلق اچھی رائے قائم کر ہی نہیں سکتا ہے۔ بطور جنگی قیدی جب وہ کلکتہ پہنچے تو اس کا منظر انہوں نے جس طرح سے پیش کیا وہ سچائی پر تو مبنی تھا مگر اس میں ایک قیدی کا احساس زیاں واضح انداز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> کلکتہ کے مضافات میں پہنچ کر جہاز بلندی سے پستی پر مائل ہوا۔ نیچی نگاہ ڈالی تو افلاس زدہ دیہاتوں کی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ جہاز ذرا اور نیچے آیا تو کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں اور ان کے مویشیوں کی پسلیاں دکھائی دیں۔ یوں بھارت کی عظمت کا پہلا اشتہار فضا ہی سے دیکھ لیا۔[49]

صدیق سالک بلیک ہول میں قید کے دوران بھی ایسے بہت سے اذیت ناک لمحات سے گزرے تھے جو کسی بھی عام انسان کی بنیادیں ہلانے کے لیے کافی تھے۔ جسمانی اذیت سے کہیں زیادہ نفسیاتی اذیت تھی جو ہندوستانی فوج نے پاکستانی فوج کو پہنچائی تھی۔ صدیق سالک کی ہندوستان کی اک اک شے سے نفرت میں کسی حد تک وہ رویے بھی شامل تھے جو ہندوستانی فوج نے پاکستانیوں سے روا رکھے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی ہ ان کی تحریروں میں سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے جو واقعات، تجربات اور احساسات ملتے ہیں وہ حقائق پر مبنی تو ہیں مگر ان میں اپنے تاثرات کا اظہار کسی حد تک جانبدارانہ ہے۔ ایک جگہ گارڈ کمانڈر صدیق سالک کو بند کرتے ہوئے جو رویہ روا رکھتا ہے اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> گارڈ کمانڈر نے دوبارہ مجھے بلیک ہول میں بند کر دیا۔ اس میں داخل ہوتے ہوئے میں نے کمرے کے ماتھے پر دس کا ہندسہ پڑھ لیا آئندہ حوالوں میں مجھے قیدی نمبر ۱۰ کے نام ہی سے پکارا جانے لگا۔ دس نمبر قیدی اندر بکواس کر رہا ہے" اسے منع کرو"، "اب دس نمبر کو پانچ منٹ کیلئے کھول دو"، "اب دس نمبر کو پیش کر دو" وغیرہ وغیرہ۔ [۵۰]

دوران قید صدیق سالک سے جس انداز میں تفتیش کی گئی اس کا بیان وہ جن الفاظ میں کرتے ہیں اس سے ان کی بھارتی حکام اور افواج کے لیے نفرت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جنیوا کنونشن کے مطابق ایک جنگی قیدی سے جس طرح کا سلوک روا رکھا جانا چاہیے اس سے روا رکھا جانے والا سلوک اس کے بالکل متضاد تھا۔ بحیثیت افسر اور انسان وہ جس سلوک کے مستحق تھے اس کا نہ ملنا بھی ان کی نفرت میں شدت کا سبب ہو سکتا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> پہلا مہینہ تو صرف ذہنی طور پر مغلوب کرنے کیلئے وقف تھا، چنانچہ میں دو رائفل بردار سپاہیوں سمیت ملحقہ احاطے کے ایک دقیانوسی کمرے میں داخل ہوا جس میں ایک میز اور دو کرسیاں پڑی تھیں اس کی ابتر حالت سے پتہ چلتا تھا کہ ایک گھٹیا قسم کا دفتر ہے جہاں گھٹیا آدمی بیٹھ کر گھٹیا ذرائع سے قیدیوں سے معلومات اخذ کرتے ہیں۔ [۵۱]

صدیق سالک کے ہاں تمام حالات و واقعات کا بیان ایک ترتیب اور تسلسل سے چلتا ہے۔ جہاں وہ سقوط ڈھاکہ کے نتیجے میں بطور جنگی قیدی اپنے حالات و تاثرات کو بیان کرتے ہیں۔ یہاں جنگ بیتی اور خود بیتی کا ایک حسین امتزاج ملتا ہے۔ جس میں مزاح کا عنصر ہمیشہ جھلکتا ہے کیوں کہ وہ اُن کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ مگر وہ طبیعت پر گراں نہیں گزرتا بلکہ انسان کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ مزاح جو ان کی طبیعت کا خاصہ تھا قاری کو ان کی تحریر سے اور خود ان کی شخصیت سے قریب کرتا ہے۔ شریف فاروق ایک مضمون میں صدیق سالک کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

میں سوچتا ہوں جو شخص بیک وقت میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا اور ہمہ یاراں دوزخ کے ساتھ ساتھ تادم تحریر جیسی طنز و مزاح میں ڈوبی ہوئی کتاب لکھ دے اس کے اعصاب کا آہنی پن اور اس کے مزاج کی درخشندگی میں کسے کلام ہو سکتا ہے۔ [۵۲]

قید و بند میں گزرے لمحات کے ساتھ ساتھ جب جب صدیق سالک کو دیگر قیدیوں کے ساتھ دوسرے کیمپ میں بھیجا جاتا وہ حتی الامکان کوشش کرتے کہ اس کے گرد و پیش کا درست نقشہ پیش کر سکیں۔ کیمپ ۴۴ کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

چلیے سنتری کو چھوڑیے مانا کہ اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر یا موسم بادوباراں کا فائدہ اُٹھا کر اس دیوار کو عبور کر لیا تو ستر اسی فٹ آگے ایسی ہی ایک اور دیوار آئے گی جس تک پہنچنے کیلئے خاردار تاروں کے گچھوں، پہریداروں کے رہائشی خیموں اور گشت کرتے کتوں سے گزرنا ہو گا۔ [۵۳]

کیمپ کے آس پاس کے ماحول اور جنگی صعوبتوں کے حالات کی تصدیق دیگر عسکری افسران کی لکھی گئی تحریروں سے بھی ہوتی ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ بھارت نے قیدیوں سے کیسا سلوک روا رکھا تھا۔ کرنل مقبول حسین قید و بند کی صعوبتوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے اپنی کتاب کیمپ ۴۵ میں لکھتے ہیں کہ:

یہاں حفاظتی اقدامات انتہائی سخت تھے۔ گشت والے سپاہیوں کے ہاتھوں میں کتوں کی زنجیریں ہوتیں اور کتے گشت کرتے ہوئے خون خوار منظر پیش کرتے۔ [۵۴]

قید و بند کے حالات کو قلم بند کرتے ہوئے صدیق سالک نے صرف ذاتی واقعات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ بہت سے سپاہیوں اور افسران کے حالات کو بھی مختصراً لکھا جس کو پڑھ کر قاری دیگر فوجی افسران پر بیتی داستانِ غم سے بھی واقفیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے اندازہ لگانا آسان ہو جاتا ہے کہ بھارتی جارحیت میں پاکستانی قیدیوں نے اپنے روز و شب کس طرح کاٹے تھے۔ اپنی کتاب کے باب **حدیث دیگراں** میں بہت سے یاروں پر بیتی سرگزشت مختصراً بیان کرتے ہیں۔ لیفٹیننٹ کرنل ملک کے ساتھ کی گئی تعارفی گفتگو کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

مجھے قید تنہائی کے علاوہ ہتھکڑیوں میں بھی رکھا گیا، یہاں تک کہ وضو کرنے اور نماز پڑھنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ [۵۵]

بھارت کی طرف سے پہنچائے گئے درد و غم صرف جسمانی نہیں تھے ان میں بیشتر نفسیاتی تھے مثال کے طور پر انسان کی عزت نفس مجروح کرنا وغیرہ۔ صدیق سالک نے جتنے لوگوں کی داستانِ غم لکھی ان میں بہت سوں کے ساتھ پیش آنے والے واقعات نفسیاتی طور پر بہت اذیت دیتے ہیں۔ رنگ پور سے آنے والے کیپٹن سید نے بھاگنے کی

ناکام کوشش کے عوض جتنی اذیتیں برداشت کیں وہ جنیوا کنونشن کی کسی شق کا حصہ نہیں تھیں۔ صدیق سالک اس جوان کی کہانی اسی کی زبانی لکھتے ہیں:

> مجھے پہلے توزدوکوب کیا گیا، کئی روز قید تنہائی میں رکھا گیا اور کھانے پینے کو کچھ نہ دیا گیا۔ لیکن جب مجھے سر بازار رسوا کیا گیا تو میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ میرے کپڑے اتروا کر میرا منہ کالا کر دیا گیا اور ہتھکڑیاں اور بیڑیاں پہنا کر شہر کے بارونق بازاروں میں پیدل پھرایا گیا۔۔۔ گالی گلوچ کے ساتھ ساتھ بازاری غلاظت مجھ پر پھینکی گئی۔[۵۶]

اس قدر تذلیل کسی بھی انسان کے قوی کو متاثر کر دینے کے لیے کافی تھی وہ تو پھر دنیا کی سب سے بہترین فوج سے تعلق رکھتے تھے۔ ایسے میں ان کی ذہنی کیفیت کا متاثر ہو جانا ایک فطری عمل تھا۔ بھارت کا اس قدر مکروہ چہرہ اس سے قبل نہیں دیکھا گیا۔ مگر قید اور جنگ سب کچھ واضح کر دیتی ہے۔ براہ راست جنگی قیدی کی حیثیت سے انہیں جن حالات وواقعات سے دوچار ہونا پڑا، وہ شخصیت کی شکست وریخت میں بہت اہم ثابت ہوئے۔ یہی نہیں بلکہ دورانِ قید مریضوں سے بھی بہت ناروا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ اگر کوئی بیمار ہو جاتا تو اسے گلنے سڑنے کیلئے قید میں رہنے دیا جاتا۔ بہت سے ایسے فوجی افسران اور سپاہی تھے جو ان تمام حالات کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ کئی تو جان سے گزر گئے اور کئی حواسوں سے۔ صدیق سالک کو قیدیوں کے ہسپتال میں جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کے مناظر بھی بہت دل سوز تھے۔ کئی سپاہی پاگل ہو چکے تھے لکھتے ہیں کہ:

> ایک پاگل چلا رہا تھا۔ "یہ پاکستان ہے کون کہتا ہے پاکستان جاؤ۔" میں پاکستان نہیں جاؤں گا یہی پاکستان ہے۔۔ دوسرا پاگل ہندوستان پر برس رہا تھا"" لاؤ اندرا گاندھی کو میں اس کو ٹھیک کرتا ہوں میں پاگل نہیں ہوں۔[۵۷]

بھارتی افسران اور حکام جس طبعی امداد کا پوری دنیا میں ڈھنڈورا پیٹ رہے تھے اس کا تماشہ پاکستانی قیدیوں کی بیرکوں میں جا کر لگایا جا سکتا تھا۔ غلیظ ماحول، مکھیوں اور مچھروں سے لبریز خوراک، بے رحمانہ سلوک، طبی سہولیات کا فقدان، بنیادی ضروریات کی شدید قلت اور اس کے علاوہ ایک مسلسل ذہنی وجسمانی اذیت یہ سب بھارتی حکام کا شیوہ تھا۔ پاکستانی قیدیوں کی حالت ناساز ہوتی تب بھی ان کی طبیعت پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ صدیق سالک اپنے گردے کی تکلیف کی بنا پر جتنا عرصہ ہسپتال میں رہے اس دوران مختلف مریضوں سے ان کی داستان رنج و الم بھی پوچھتے رہے۔ ایک مریض اپنا حال کچھ اِس انداز میں بتاتا ہے:

جنگ میں میرا دایاں بازو اور ٹانگ زخمی ہوئی تھی۔ آپریشن کی بجائے بس وقتاً فوقتاً مرہم پٹی ہوتی رہی۔ اب حال یہ ہے کہ ٹانگ سکڑ کر چھوٹی ہو چکی ہے اور بازو کی ہڈیوں میں پیپ پڑ گئی ہے۔[۵۸]

نفسیاتی دباؤ کی اس جنگ میں بھی بھارت نے ہمیشہ کی طرح اپنا مکمل کردار ادا کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ قیدیوں کے لیے مختلف اکابر پند و نصائح کی غرض سے بلوائے جاتے، منتخب فلمیں دکھائی جاتیں اور کبھی کلچر شو کا اہتمام ہوتا مگر ان سب میں جو قدر مشترک تھی وہ پاکستانی قیدیوں کو دو قومی نظریہ کے خلاف قائل کرنا تھا۔ اس نفسیاتی جنگ کی ابتداء ڈھاکہ سے ہی کر دی گئی تھی۔ بھارت پہنچنے کے بعد اس میں شدت آ گئی اور بھارت نے قیدیوں کی ذہنی تربیت کا بیڑا اُٹھایا تاکہ اسیری کے فارغ دنوں میں وہ بھارت کی عظمت، امن پسندی، انسان دوستی اور سیکولرزم کے قائل ہو سکیں۔ صدیق سالک اپنی کتاب کے باب نفسیاتی جنگ میں ایک ایسے ہی بھارتی نمک خوار سے کی گئی گفتگو کو اس کے الفاظ میں بیان کیا ہے:

میں علی گڑھ میں پڑھتا ہوں، جہاں میرے حلقہ احباب میں ہندو کم اور مسلمان زیادہ تھے۔ تقسیم تک ان کے ساتھ برادرانہ تعلقات رہے۔ ان کے بچے میری گود میں، اور میرے بچے اُن کی گود میں پلے بڑھے۔ لیکن کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اب ہم آپس میں مل سکتے ہیں نہ بچے۔[۵۹]

یہ اور اس طرح کے بہت سے نفسیاتی حربوں کا استعمال پاکستانی قیدیوں کی تربیت کے لیے کیا گیا تھا مگر اس مقام پر بھارت کو ہمیشہ منہ کی کھانا پڑی تھی۔ صدیق سالک کہتے ہیں کہ ان تمام حربوں کا ردعمل ہماری طرف سے ہمیشہ نہایت منفی انداز میں ہوا کرتا تھا۔ قیدیوں کی طرف سے دیے گئے جوابات مقرر کو کبھی لاجواب کر دیتے تو کبھی وہ بھونڈی سی وضاحت دے دیا کرتے۔ بیرونی تجارت کے مرکزی سیکٹری مسٹر یونس بھی بھارتی عزائم کو لے کر قیدیوں سے گفتگو کرنے آئے تھے۔ صدیق سالک کہتے ہیں کہ جیسے ہی انہوں نے ہڑپہ اور موہن جو داڑو کی تہذیب کے متعلق گفتگو شروع کی تو اصحاب کا ردعمل فوراً ظاہر ہوا۔ لکھتے ہیں:

جونہی اس نے موہن جو داڑو کے کھنڈروں میں قدم رکھا گھات نشینوں نے اسے جالیا۔ چار پانچ آدمی آدابِ محفل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بول پڑے۔ ان کا جوش و خروش دیکھ کر مجھ سے بھی رہا نہ گیا۔ میں بھی پانچوں سواروں میں شامل ہو گیا۔[۶۰]

غرض بھارت کے تمام اوچھے ہتھکنڈوں کے باوجود بھی قیدیوں نے سر تسلیم خم نہیں کیا تھا۔ ان سب حالات میں وطن کی محبت مزید پروان چڑھ گئی تھی۔ قید تنہائی نے ملک کی اہمیت کا احساس دلا دیا تھا۔ صدیق سالک بہت سے مقامات پر نہایت جذباتی انداز میں حب الوطنی سے مغلوب ہو کر وطن کی محبت میں لکھتے ہیں۔ ایسی جگہوں پر

جہاں ایک طرف بھارت سے شدید نفرت کا اظہار ملتا ہے وہیں اپنے ملک کی محبت بھی دامن گیر محسوس ہوتی ہے۔ دورانِ قید پاکستان بھارت کے ہاکی میچ کا احوال ریڈیو پر سن رہے تھے اور اس میچ سے سب قیدیوں کی جذباتی و دلی وابستگیاں تھیں۔ اس دوران پاکستان کی فتح کا اظہار کچھ اس انداز میں کرتے ہیں:

> بھارت پر پاکستان کی فتح۔ پتہ نہیں ان پانچ لفظوں میں کیسی کیسی خوابیدہ خواہشات کی تسکین کا سامان پوشیدہ تھا۔ اس خبر نے ایک عجب نشے اور سرور سے ہمیں ہمکنار کیا۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔
>
> ہم سب ریڈیو چھوڑ کر ناچنے لگے۔ [۶۱]

قید و بند کے اس زمانے میں قیدیوں کو ان چھوٹی چھوٹی خوشیوں کی فتح بھی بہت بڑی معلوم ہوتی تھی۔ ملک کی سالمیت اور بقا کی خاطر لڑنے والی فوج بیرکوں میں قید تھی مگر ان کی سوچ، ان کے جذبے آزاد تھے اور یہ آزادی ان سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ خوشی و مسرت کے چھوٹے چھوٹے لمحات بھی ضائع نہیں کرتے تھے۔ در حقیقت ملک کی محبت کا احساس صحیح معنوں میں دشمن کی قید میں ہوا تھا۔ صدیق سالک اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> میں دوسرے پاکستانیوں سے زیادہ حب وطن کا دعویدار نہیں لیکن یقین کیجئے پاکستان کی قدر و منزلت کا جو احساس اس کال کوٹھڑی میں ہوا۔ عام حالات میں شاید کبھی نہ ہوتا پاکستان! میرا پاکستان! میرے جگر کی طرح دو نیم پاکستان!!
>
> ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات۔ [۶۲]

صدیق سالک کی وطن سے محبت اور جذبہ حب الوطنی بالکل اسی طرح اس قید و بند میں خدا کی ذات پر ان کا یقین وہ قید تنہائی جہاں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا وہاں خدا کی ذات ہی ان کا واحد سہارا تھی۔ کال کوٹھڑی میں گزارے دنوں میں اگر خالقِ حقیقی کی مدد ساتھ نہ ہوتی تو ان کے لیے وہ لمحات بہت کٹھن تھے۔ اس کیفیت کو صدیق سالک اس طرح بیان کرتے ہیں:

> کعبہ وہیں سرک آیا جبیں میں نے جہاں رکھ دی، کے مصداق اپنی دانست کے مطابق قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنی شروع کر دی۔ اندھیری رات کی گھمبیر تنہائی میں قیام طویل اور سجدے طویل تر ہو گئے۔ رکوع کے لیے کمر جھکاتا تو دل پہلے جھک جاتا۔۔۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین کا جو مفہوم اس کال کوٹھڑی میں سمجھ آیا، کبھی کوئی خطیب، کوئی مفسر، کوئی واعظ نہ سمجھا سکا۔ [۶۳]

مذہب ان کے لیے اُس قید میں اک ایسی روشنی کی کرن کی طرح تھا جس سے نہ صرف صدیق سالک بلکہ بہت سے قیدیوں کے دل منور ہوئے تھے۔ مذہب سے لگاؤ کا ہی اثر تھا کہ ان الم ناک لمحات میں بھی امید کا دامن ان کے ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ قید و بند کی طویل راتوں میں صبر و سکون ان کا ہم راہی تھا۔ وطن واپسی کی امید، خدا پر مکمل یقین اور بھروسہ اور ایمان کی طاقت کا ہی اثر تھا کہ وہ ذہنی طور پر ویسے متاثر نہیں ہوئے، جس طرح دیگر قیدیوں نے قید کو خود پر حاوی کر لیا تھا۔ ان کی مضبوط قوت ارادی ہی تھی جس نے انہیں ان گھٹاٹوپ اندھیروں میں بھی امید کے دیئے جلائے رکھنے کا حوصلہ دیا۔ یہی امید تھی جو ان کی مزاحیہ تحریروں کے پردے سے جھانکتی محسوس ہوتی ہے۔ فطری مزاح نگاری جو ان کی تحریر میں موجود غم اور درد کو مزاحیہ انداز میں پیش کرتی ہے۔ اس لیے ان کی تحریر جو پہلی دفعہ پڑھنے پر مزاح نگاری کا عنصر لیے محسوس ہوتی ہے اگر جملوں پر غور کریں تو ایک ایسا نوحہ بیان کرتی ہے جس نے ساری قوم کو ذلت کی عمیق گہرائیوں میں غرق کر دیا تھا۔ مزاح کے پردے میں کہی ہوئی غم کی بات انسان کو ایک ایسے احتسابی عمل سے گزارتی ہے جہاں سے حقائق کھل کر سامنے آتے محسوس ہوتے ہیں۔ صدیق سالک کی کتاب **ہمہ یاراں دوزخ** کے متعلق سید ضمیر جعفری لکھتے ہیں کہ:

> سالک نے جس انداز میں کتاب لکھی میرے خیال میں وہ اس کے لیے موزوں نہ تھا۔ مگر کتاب پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ اسی انداز نے تو جسم واقعہ میں جان ڈال دی ہے۔[۶۴]

صدیق سالک کی تحریروں میں قدرتی توازن بہت خوبصورتی کے ساتھ ملتا ہے۔ قومی اور سنجیدہ موضوعات کو انہوں نے خونِ جگر سے رقم کیا ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے سقوط ڈھاکہ، ہتھیار ڈالنا، بھارت کا پاکستانی قیدیوں کو جیل میں منتقل کرنا، جسمانی و ذہنی شکست کو انتہائی درد انگیز انداز میں لکھا ہے۔ جبکہ قیدیوں کے مشاغل، روزمرہ عادات، نفسیات، جیل کی ناقص سہولیات اور حکام کے رویے کو مزاحیہ وطنزیہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ وہ غم کی کالی رات کو بیان کرتے ہیں تو امید کے چراغ بھی روشن کرتے ہیں۔ باب **گوشے میں قفس کے** میں لکھتے ہیں کہ:

> اپنے نئے کاشانے میں پہنچ کر گرد و پیش پر نگاہ ڈالی تو سب سے پہلے سور ہی سور نظر آئے۔ (میری مراد اصلی سوروں سے ہے)۔ بھورے بھورے، کالے کالے، موٹے موٹے، تازے تازے، یہ ہمارے بلاک کے پیچھے گندے نالے میں محوِ خرام تھے۔ میرے خیال میں ان کی وہاں موجودگی محض اتفاقی تھی۔ ان کا ہمارے استقبال سے کوئی تعلق نہ تھا۔ کیوں کہ اس کام کیلئے کوئی سو سوا سو بھارتی سپاہی موجود تھے۔[۶۵]

صدیق سالک نے ہمہ یاراں دوزخ میں بہت سے حقیقی کرداروں کو بھی پیش کیا ہے جو ان کی عسکری زندگی اور سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ یوں تو ان کی کردار نگاری میں بہت سی شخصیات شامل ہیں مگر خواص و عوام سب کو اپنی تحریر میں جگہ دینا ان کا خاصہ ہے۔ معاشرتی رویوں اور کرداروں کی جس قدر بہتر تشریح و توضیح ان کی تحریروں میں ملتی ہے وہ ان کو بطور عسکری ادیب متعارف کروانے میں بہت اہم رہی۔ وہ کرداروں کے ظاہری حلیے سے زیادہ ان کی عادات اور گفتار کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور سقوط ڈھاکہ کے وہ کردار جو عالمی شہرت رکھتے ہیں ان کا چہرہ زیادہ واضح انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اپنے پیش کردہ کرداروں میں سب سے موثر اور حقیقی کردار جو صدیق سالک نے پیش کیا تھا وہ سیکنڈ لیفٹیننٹ اعجاز رضوی کا ہے۔ اس کردار کا خاکہ وہ اس طرح سے پیش کرتے ہیں کہ وہ قاری کے سامنے حقیقی انداز میں چلتا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔ اس کردار اسے ان کی جذباتی وابستگی تھی کیوں کہ اعجاز رضوی اور صدیق سالک دونوں کو اپنی والدہ سے غیر معمولی محبت تھی۔ اعجاز رضوی کی فرار کی کوشش میں شہادت نے انہیں بہت غمگین کر دیا تھا۔ اس کردار کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> نو عمر نو آموز اور نوخیز، گورا رنگ جو ہر وقت کھلا رہتا اور شرارتی آنکھیں جو مسکراتے وقت خود بخود بند ہو جاتیں سیمابی جسم، کتابی چہرہ اور شتابی چال وہ سارے کیمپ میں یوں آناً فاناً پھرتا جاتا جیسے روشنی کی کرن تاریکی میں پھرتی ہے۔[۶۶]

صدیق سالک نے جنرل نیازی، جنرل اروڑہ اور دیگر بھارتی حکام اور افسران حوالدار، بھنگی، اردلی اور دیگر بہت سے دوستوں کے کردار بھی پیش کیے جو اپنی اپنی شخصیت کے لحاظ سے صداقت کا مرقع ہیں۔ صدیق سالک کی تحریروں میں نہ صرف کرداروں کے حوالے سے بلکہ حالات و واقعات کے حوالے سے بھی صداقت کا پہلو بہت نمایاں رہتا ہے۔ وہ جنرل نیازی کا کردار میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا میں تفصیلاً بیان کرتے ہیں۔ اس حوالے سے اس کتاب میں ان کا ذکر نہایت مختصر ہے۔ وہ جنرل اروڑہ کا کردار کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

> اروڑہ خالص سکھ نسل کا عمدہ نمونہ تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھوں کے جنگل کے اس پار پگڑی کا ایک چبوترہ تھا۔ جس کے گرد جرنیلی کی لال پٹی لگی ہوئی تھی۔ اگر کندھوں سے نیچے دیکھا جائے تو بالکل انسانی پیکر نظر آتا تھا لیکن جوں جوں نگاہ اوپر اُٹھتی اپنے مشاہدے پر شک ہونے لگتا۔[۶۷]

صدیق سالک کی کتاب ہمہ یاراں دوزخ اپنے تمام تر واقعات، حالات، احساسات اور ادبی لوازمات کے ساتھ ایک ایسی تحریر ہے جو سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ادبی و نثری تحریر جذبہ حب الوطنی سے لبریز ہے اور حقائق کا مدلل رخ قاری کے سامنے پیش کرتی ہے۔ بھارت کا مکروہ چہرہ اس کتاب کے ذریعے

بہت آسانی کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ مجموعی طور پر ہمہ یاراں دوزخ اردو ادب کا ایک ایسا دیا ہے جس سے ہمیشہ تاریخ کا چہرہ دیکھنے میں راہنمائی ملتی رہے گی۔

میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا صدیق سالک کی انگریزی کتاب جس کا اردو ترجمہ وٹنس ٹو سرنڈر کے عنوان سے ہے۔ اس کتاب کو بقول صدیق سالک ادب سے دور اور تاریخ کے قریب رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سقوطِ ڈھاکہ کی تاریخ پر مبنی یہ کتاب ان تاریخی واقعات اور حقائق کو پیش کرتی ہے جو بطور عینی شاہد صدیق سالک کو پیش آئے۔ اس کتاب میں شخصیات، واقعات اور حالات کا تجزیہ تاریخی حقائق اور دلائل کو مد نظر رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ صدیق سالک نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اس تحریر کو رقم کرنے میں اپنے ان تمام ذاتی تجربات، حالات اور واقعات کو جو سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے انہیں پیش آئے تھے ان کو بیان کریں۔ مشرقی پاکستان کی ناقابل بیان سیاسی فضا، خانہ جنگی اور پھر جنگ کی ہولناکیوں کو انہوں نے جس انداز میں دیکھا اور محسوس کیا اس کو بیان کر دیا۔ تاریخ کے اس بیان میں ان کی اپنی ذات شامل حال رہی تھی۔

کتاب بنیادی طور پر تین حصوں میں منقسم ہے۔ سیاسی افق، خانہ جنگی اور جنگ کے عنوان سے تینوں حصوں میں صدیق سالک نے سقوط ڈھاکہ سے قبل، دوران اور اس سے متعلقہ واقعات قلم بند کیے ہیں۔ کتاب کا آغاز شیخ مجیب الرحمٰن کے انتخابی جلسے سے ہوتا ہے۔ کتاب کے اس حصے **سیاسی افق** میں ایک ترتیب اور تسلسل کے ساتھ واقعات آگے بڑھتے جاتے ہیں۔ صدیق سالک نے بہت سی کتب، جرائد اور رسائل کے حوالہ جات سے اپنی بات کی تصدیق کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجیب الرحمٰن نہ صرف اس کتاب بلکہ ہماری تاریخ میں بھی ایک ایسا کردار ہیں جن کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ عوامی لیگ کی مقبولیت اور اس سے جڑے تمام قابل ذکر حالات و واقعات کے ساتھ صدیق سالک نے ان پہلوؤں کو بھی دیکھا جو اس سانحے کے ذمہ دار تھے۔

سیاسی افق میں جیسے جیسے واقعات آگے بڑھتے ہیں صدیق سالک ایک تسلسل سے واقعات کو پیش کرتے ہیں۔

ڈھاکہ پہنچنے کے بعد انہوں نے وہاں کی غربت کی جس طرح عکاسی کی ہے اس کا انداز قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان کی غربت اور مفلوک الحالی کا احتسابی انداز سے تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میں نے محسوس کیا کہ بنگال کا عام غریب آدمی مغربی پاکستان کے انتہائی غریب آدمی سے بھی غریب تر ہے۔ میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے لگا۔[۶۸]

براہ راست پیش آنے والے واقعات کا حوالہ دے کر صدیق سالک نے اس حقیقی تصویر کو پیش کرنے کی کوشش کی جس کا ایک رخ تو مغربی پاکستانی دیکھ سکتے تھے مگر دوسرا نہیں۔ معاشی تقسیم کے علاوہ مشرقی اور مغربی حصے کے لوگوں کے تعلقات کو بھی قریب نہیں پایا۔ یہاں ایک واضح فرق موجود تھا۔ بحیثیت فوجی جب وہ ڈھاکہ میں تعینات ہوئے تو وہاں کے عسکری اہلکاروں کا رویہ جانچا جو ایک عام بنگالی سے محبت کا نہیں تھا۔ لکھتے ہیں:

میں نے اپنا ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالا اور چند سکے اس غریب لڑکے کو دینا چاہے مگر حوالدار نے پرزور لہجے میں کہا "سر ان حرامزادوں کی عادت نہ بگاڑیے۔ [69]

صدیق سالک نے عوامی لیگ اور دیگر سیاسی پارٹیوں جو مشرقی و مغربی پاکستان میں تھیں کے حالات کا بھی ساتھ ساتھ جائزہ لیا۔ ان میں نمائندہ پارٹی مجیب الرحمٰن کی تھی۔ جس نے عوامی لیگ کے نام سے پورے مشرقی پاکستان کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ صدیق سالک اس پارٹی کی مقبولیت سے متعلقہ واقعات بھی بیان کرتے ہیں۔ مشرقی پاکستانی مجیب کو اپنا ہیرو مانتے تھے۔ ان کا یہ ہیرو انتخابات سے قبل ہی ان کے دلوں کی نشستیں جیت چکا تھا۔ مجیب الرحمٰن نے اس قدر جذباتی وابستگی کا دل کھول کر فائدہ اٹھایا۔ عوام کو لمحوں میں اشتعال دلانا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ اس سب منظر نامے میں ملکی سالمیت کو جو خطرہ لاحق ہو چکا تھا اس میں ایک بڑا سبب بنگالیوں میں تیزی سے اُبھرتا ہوا قومیت کا تصور بھی تھا جس کو پروان چڑھانے میں مجیب الرحمٰن نے دل کھول کر اپنا حصہ ڈالا تھا۔ اپنے پیش کردہ چھ نکات کو لے کر مجیب الرحمٰن نے عوام کو جس ڈگر پر ڈال دیا تھا۔ اس کے تمام راستے علیحدگی کی سمت جاتے تھے۔ صدیق سالک نے اس کے قریبی حلقوں میں انکی پیش کردہ رائے کو بیان کیا ہے:

میرا مقصد بنگلہ دیش کا قیام ہے۔ انتخابات ختم ہوتے ہی میں ایل۔ ایف۔ او کو پرزے پرزے کر دوں گا۔ کون ہے جو انتخابات کے بعد میرے سامنے ٹک سکے۔ [70]

مجیب الرحمٰن جیسے شعلہ بیان مقرر سے ایسی گفتگو کی توقع کی جاسکتی تھی۔ سر میلا بوس اپنی کتاب *Dead War Memories of Reckoning Bangladesh War 1971* جس کا ترجمہ نذر حسین کاظمی نے ڈھاکہ کہانی، کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی کے نام سے کیا ہے میں ایک دیہاتی کی زبانی محفوظ کئے گئے الفاظ اس طرح بیان کرتی ہیں:

شیخ مجیب کی تقاریر ہی تھیں جن سے میں نے "انشاءاللہ" جیسے الفاظ کا استعمال سیکھا تھا۔ وہ یوں گرجا کرتے تھے "ہم نے خون دیا ہے ہم اور خون دینے کیلئے بھی تیار ہیں۔ میں اس سرزمین کے لوگوں کو آزادی دلوا کر رہوں گا۔ انشاءاللہ۔ [71]

مجیب الرحمٰن کے اس اشتعال انگیز رویے نے بنگالیوں کے دلوں میں مغربی پاکستانیوں اور بہاریوں کیلئے جو نفرت ڈال دی تھی اس کا خمیازہ تاریخ نے سقوط ڈھاکہ کی صورت میں بھگتا مگر صدیق سالک یہاں صرف مجیب الرحمٰن کو ہی قصور وار نہیں گردانتے ہیں۔ بلکہ مشرقی پاکستان میں احساس محرومی کی ذمہ داری بہت سے کاندھوں پر آن پڑتی ہے۔ اُن کے مطابق مشرقی پاکستان میں احساس محرومی کے سدباب کے لیے کوئی معقول کوشش کی ہی نہیں گئی تھی جس کا نتیجہ سیاسی، معاشی اور نظریاتی شکست کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ صدیق سالک پاکستان کونسل برائے قومی یکجہتی کی ڈھاکہ شاخ کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر سے مل کر ان کی گفتگو کا حوالہ پیش کرتے ہیں۔ جس کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ڈھاکہ کا پڑھا لکھا طبقہ نظریاتی لحاظ سے مغربی پاکستان سے بہت دور چلا گیا تھا۔ جہاں متحدہ پاکستان کا تصور دھندلا پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ لکھتے ہیں:

> لائبریری کے اس چکر میں وہ ایک جگہ اور رُکے اور شیلف کی طرف اُنگلی اُٹھاتے ہوئے کہا: "یہ سارا شیلف تمہارے قائد اعظم سے متعلق کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔ زور "تمہارے" پر تھا جس کی چبھن مجھے محسوس ہوئی اور میں ٹیس کو دل میں سمیٹ کر واپس چلا آیا۔ [۲۷]

صدیق سالک عسکری حالات کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ان تمام نظریاتی، سیاسی و معاشی انتشار سے فوج بھی اپنا دامن بچا نہیں پائی تھی اور بنگالی و غیر بنگالی فوج میں لڑائیوں اور تصادم کے واقعات سامنے آنا شروع ہو گئے تھے۔ ان پر قابو پانے کیلئے صدر یحییٰ کو آگاہ کیا جاتا رہا۔ دوسری طرف عوامی لیگ اس قدر طاقت ور ہو گئی تھی کہ دیگر سیاسی پارٹیوں کے انتخابات کے حوالے سے جلوس کو ناکام بنا دیتی تھی۔ مختلف طریقوں سے فساد برپا ہو جاتا یا پارٹیوں کا اندرونی خلفشار بھی ان کی ناکامی کا سبب بنتا۔ دونوں صورتوں میں فائدہ عوامی لیگ کو ہوا۔ صدر یحییٰ مجیب الرحمٰن اور بھٹو جیسے متنازعہ کرداروں کے ساتھ ساتھ صدیق سالک میجر جنرل فرمان، ایڈمرل احسن اور میجر جنرل یعقوب علی خان کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ یہ لوگ بنگالی عوام کے مسائل کے سلسلے میں ہمدردنقطہء نظر رکھتے تھے۔ مگر صدر یحییٰ کی شخصیت کا اظہار جس منفی انداز میں کرتے ہیں اس سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس وقت حکام بالا اپنے فرائض سے کس قدر روگردانی کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ صدر یحییٰ کا مجیب الرحمٰن سے نرم رویہ ہوا کو کسی اور رخ میں لے کر جا رہا تھا۔ عوامی لیگ کے بے لگام رویے میں یحییٰ خان کی اسی نرم روی کا ہاتھ تھا۔

عوامی لیگ کے اثر ورسوخ کی وجہ سے لوگ ڈرے ہوئے تھے۔ ہنگامے ہر طرف ہونا شروع ہو چکے تھے اور ان ہنگاموں میں طلبا اور مزدور پیش پیش تھے۔ ہر طبقے سے تعلق رکھنے والوں نے ہڑتالیں شروع کر دی تھیں۔ نظام زندگی دن بدن مفلوج ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بدامنی، دہشت گردی اور صنعتی انتشار نے ایک بے یقینی کی فضا پیدا کر دی

تھی۔ بموں اور دھماکوں کی اطلاعات بھی آنا شروع ہو چکی تھیں۔ صدیق سالک نے اس ساری صورتحال کو مختصر مگر نہایت مدلل انداز میں پیش کیا۔ یہ وہ صورتحال تھی۔ جس میں ۱۹۷۰ کے انتخابات ہونے جا رہے تھے۔ بطور عسکری نمائندہ صدیق سالک نے اس رویے کا بھی بغور جائزہ لیا جو بنگالی عوام، فوج کے لیے اپنے دل میں رکھتی تھی اور وہ رویہ نفرت کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔ بنگالی عوام کی نفرت کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> مجیب نے اشتعال انگیزی کا ہر حربہ آزمایا۔ فوج کے لیے ریل اور سڑکیں استعمال کرنے کی ممانعت کر دی مقامی ٹھیکیداروں کو راشن سپلائی کرنے روک دیا اور جہاں ان کا سامنا ہوتا انہیں گالیاں دی جاتیں مگر آفرین ہے ڈسپلن کے ان مجسموں پر کہ انہوں نے خشک راشن کی دال اور عوامی لیگ کی گالیاں کھا کر گزارہ کر لیا مگر فوجی ڈسپلن کے خلاف کوئی حرکت نہ کی۔ [۳]

اس نفرت کو ہوا دینے میں عوامی لیگ نے نمائندہ کردار ادا کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بنگالی طویل عرصے سے خود کو امتیازی سلوک کا شکار سمجھتے تھے لیکن بعض اوقات وہ غلط اعداد و شمار کا سہارا بھی لیتے تھے اور انتخابات سے قبل کی عوامی لیگ کی پالیسیاں اس بات کا ثبوت تھیں۔ مشرقی پاکستان معاشی طور پر کمزور تھا تو اس کی بھی کئی وجوہات تھیں۔ مشرقی پاکستان میں قدرتی آفات کا خوف، بھارت جیسے ازلی دشمن کا دونوں حصوں کے درمیان حائل ہونا جو تجارت میں بڑی رکاوٹ تھا، بھارت کی مسلسل سیاسی و معاشی معاملات میں مداخلت، بڑے بڑے مالیاتی اداروں کا مغربی پاکستان میں ہونا، موزوں ابلاغ اور توانائی کی کمی، تعلیم کا فقدان وغیرہ۔ اس کے علاوہ تقسیم کے بعد کے بیشتر سرمایہ کار مغربی پاکستان میں تھے۔ یہ اور اس جیسی دیگر وجوہات تھیں جو عوامی لیگ استعمال کرتے ہوئے بنگالی قوم کو اشتعال دلا رہی تھی۔ سر میلا بوس اپنی کتاب میں ایک بنگالی مصنف نرادسی چودھری کا نقطہ نظر انہی کے الفاظ میں رقم کرتی ہیں۔ نرادسی چودھری نے مشرقی پاکستان کے انتخابات کے بعد لکھا کہ:

> میرے اپنے خیال میں ایک جذباتی اطمینان کے لیے خود کو قابل رحم حالت میں پیش کرنا اور مشکلات کے نام پر کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ تمام بنگالیوں کا وطیرہ بن چکا ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ [۴]

انتخابات میں کامیابی عوامی لیگ کو ہوئی تھی۔ اکثریت پر نشستیں جیت لینے کی بنا پر اقتدار اصولاً مجیب الرحمٰن کو منتقل ہونا تھا۔ مگر مغربی پاکستان کے کچھ متنازعہ کردار جہاں اس کی راہ میں رکاوٹ تھے وہیں مجیب الرحمٰن کے چھ نکات بھی ملکی سلامتی کے خلاف تھے۔ اس صورتحال میں یحییٰ خان ڈھاکہ پہنچے مگر بات وہیں چھ نکات پر آ کر

رکی۔ ناکام مذاکرات کے بعد یحییٰ خان ۱۴ جنوری کو ڈھاکہ سے روانہ ہوئے۔ صدیق سالک بھی ان کی روانگی کے وقت ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ صدیق سالک نے اس منظر کو کچھ اس انداز سے تحریر کیا:

> روانگی سے قبل ایئرپورٹ پر صحافیوں نے انہیں گھیر لیا۔ میں بھی وہاں موجود تھا۔ جنرل یحییٰ خان زیادہ پر امید نظر نہیں آرہے تھے۔۔۔۔وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہے تھے کہ مستقبل کا انحصار مجیب الرحمٰن کے فیصلوں پر ہے۔ [۴۵]

صدیق سالک جن واقعات کے عینی شاہد تھے انہیں واحد متکلم کے صیغے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ دیگر تمام واقعات جو کسی کتاب کا اقتباس ہیں یا کسی دوسرے شخص کی زبانی پہنچنے والی معلومات بیان کرتے ہوئے یہ واضح کرتے ہیں کہ متعلقہ مواد کہاں سے لیا گیا ہے۔ صدیق سالک اس عوامی رائے کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں جو یحییٰ خان کی واپسی کے بعد عوام میں اور عوامی لیگ میں گردش کر رہی تھی۔ وطن واپسی پر یحییٰ خان بھٹو سے ملنے لاڑکانہ گئے تھے اور اس ملاقات نے جس قدر شکوک و شبہات کو جنم دیا ان کا ازالہ خود مغربی پاکستان کے حکمران نہیں کر سکے۔ صدیق سالک جو کہ اس وقت مشرقی پاکستان میں موجود تھے اس لیے عوامی لیگ کے منفی تاثرات کے متعلق اظہار دونوں صورتوں میں کرتے ہیں۔ یہاں وہ اپنی عسکری طاقت اور تعلقات کو بھی واضح کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

> مجھ جیسے افراد جن کا تعلق براہ راست عوامی لیگ سے تھا نہ پی پی پی سے یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسٹر بھٹو، یحییٰ خان کی میزبانی کا شرف حاصل کیے بغیر ڈھاکہ تشریف لے جاتے تو فضا اتنی مکدر نہ ہوتی۔ [۴۶]

صدیق سالک کی یہ رائے اس بات کی عکاس ہے کہ مشرقی پاکستان میں, مغربی پاکستان میں ہونے والے معاملات کو کس قدر تنقیدی نقطہ نظر سے دیکھا جارہا تھا۔ ۲۷ جنوری کو مسٹر بھٹو اپنے رفقا کے ساتھ ڈھاکہ پہنچ گئے مگر ۳۰ جنوری کو بغیر کسی سیاسی حل کے روانہ ہو گئے۔ اس واقعے کے پیش نظر ہندوستان کے اوپر سے گزرنے والی پروازوں کو روک دیا گیا۔ صدیق سالک کی رائے کے مطابق یہ ہندوستان کی سوچی سمجھی سکیم تھی۔ اور اب یہ حالات ایک ایسی سیاسی تکون کا روپ دھار گئے تھے جس میں یحییٰ خان، مجیب اور بھٹو کے رویوں کی وجہ سے کوئی روشنی کی کرن نظر نہیں آرہی تھی۔ رہی سہی کسر اسمبلی کے اجلاس کے التوا نے پوری کر دی تھی۔ مشرقی پاکستان میں بیٹھے جنرل بار بار اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ مانگتے رہے اور مغربی پاکستان سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ آنے پر بنگالیوں کا ہجوم اشتعال انگیز ہوتا گیا۔ صدیق سالک تینوں مرکزی کرداروں کا تجزیہ بھی ساتھ ساتھ بیان کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

اگر یحییٰ خان پر اپنے انتہا پسند جرنیلوں کا زور تھا مجیب پر اپنے انتہا پسند رفقائے کار کا دباؤ تھا اور بھٹو مغربی پاکستان کی رائے عامہ کا غلام تھا تو ان تینوں میں سے کون تھا جو صحیح معنوں میں لیڈر کہلانے کا مستحق تھا۔[۷۷]

صدیق سالک نے اس تناؤ کی صورتحال کی تصویر کشی کبھی حالات کے تجزیے کی صورت پیش کی تو کبھی مختلف عسکری حکام کی زبانی پیش کیے گئے واقعات کے ذریعے بیان کی۔ شدید ترین انتشار اور بدامنی کو سنبھالا دینے کے لیے صدر پاکستان نے ۱۰ مارچ کو ڈھاکہ آنے کا فیصلہ کیا۔ مگر ان کی آمد سے قبل ہی مارچ کے مہینے سے قتل وغارت کے واقعات شروع ہوگئے تھے۔ مجیب الرحمٰن کے حامیوں نے غیر بنگالیوں پر زندگی تنگ کر دی تھی۔ وہ لوگ چھاؤنیوں میں پناہ ڈھونڈنے لگے تھے۔ عسکری حالات کا جائزہ لیں تو سیاست نے اس کو بہت متاثر کیا تھا۔ فوج میں بنگالی یونٹوں اور مغربی پاکستان میں تعینات بنگالی افسران بھی بغاوت میں پیش پیش تھے۔ وہ آزاد بنگلہ دیش کے حامی تھے۔ جس کا قیام متحدہ پاکستان کی موت کے بعد ہی ممکن تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل شریف الحق دالیم کی لکھی گئی کتاب *Bangladesh Untold facts* جس کا ترجمہ رانا اعجاز احمد نے پاکستان سے بنگلہ دیش ان کہی جدوجہد کے عنوان سے کیا ہے۔ ایک ایسے بنگالی افسر کی سرگزشت ہے جو پاکستان کا باغی اور بنگلہ دیش کا ہیرو ہے۔ کرنل دالیم پاکستان میں ہوتے ہوئے آزاد بنگلہ دیش کا قیام چاہتے تھے۔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

ہم فرار ہو سکتے ہیں اور آزادی کی جنگ میں شریک ہو سکتے ہیں یا ہم بلیلی میں اسلحہ کے ڈپو کو اڑا سکتے ہیں، اس طرح دفاعی قوت کی اسلحہ کی دوسری لائن تباہ ہو جائے گی۔ یہ حکمران فوجی ٹولے کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہو گا۔ میں نے جواب دیا۔[۷۸]

فوج کے ہاتھوں اور عوام کے قتل وغارت اور خواتین کی عصمت دری کے جو الزامات بنگالیوں نے لگائے تھے اس کے متعلق لکھتے ہیں:

اگر سرکاری ہینڈ آوٹ میں بنگالیوں پر تشدد کی تفصیلات کو گھٹا کر بیان کیا گیا تو مقامی اخبارات نے انہیں کئی گنا بڑھا کر کسر پوری کر دی۔ لیکن جو قیامت غیر بنگالیوں {بہاریوں} پر ٹوٹی اس کا نوحہ نہ سرکاری اعلانیوں میں درج ہوا نہ اخبارات میں، ان کا خون ان کی آہوں کی طرح بے اثر گیا۔[۷۹]

جب کہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا غیر جانبدارانہ بیان صدیق سالک کی رائے کی تردید کرتا ہے۔ عسکری پیچیدگیوں کو مد نظر رکھیں تو ممکن ہے کہ انہوں نے ارادی طور پر ان واقعات کی تفصیل سے گریز کیا ہو۔ مجموعی طور پر انہوں نے فسادات کی بہت زیادہ تفصیل پیش نہیں کی ہے۔ بلکہ فسادات چاہے آرمی کے ہوں یا

بنگالیوں کے برپا کردہ، وہ اس کی بے جا تفصیل میں نہیں جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا بیان کچھ اس طرح ہے:

> ہمیں ثبوت کے طور پر مثالیں دیتے ہوئے بتایا گیا کہ مرد و خواتین کے بڑے بڑے گروہوں کو لایا جاتا اور ایک ساتھ موت کے گھاٹا تار دیا جاتا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ یہ واقعات مسلسل ہوئے۔[۸۰]

جہاں وہ فوجیوں کی کاروائی کا ذکر کرتے ہیں وہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ان کے ہاں یہ رویہ غیر بنگالیوں کے قتل عام کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ غیر بنگالیوں اور بہاریوں کا قتل عام ہو رہا تھا۔ ایسے صورتحال میں اگر فوج بغاوت کو ختم کرنے یا روکنے کے لیے نہ آتی تو امن کیسے قائم کیا جاتا۔ اس صورتحال میں یحییٰ خان ڈھاکہ میں تشریف لائے۔ ایئرپورٹ پر ان کے استقبال کے لیے موجود افسران میں صدیق سالک بھی تھے۔ انہوں نے صدر پاکستان کے چہرے کو غور سے دیکھا جو تمام تفکرات سے آزاد تھا۔ اس لمحے صدیق سالک کو لگا کہ یحییٰ خان کو اس سنگینی کا علم ہی نہیں تھا جس نے یہاں کی عسکری قیادت کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ صدر یحییٰ اور مجیب کے درمیان مذاکرات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ جنرل یحییٰ کے حکم پر ٹکا خان نے جنرل راجہ کو ٹیلی فون پر تیار رہنے کی تاکید کی تھی۔ صدیق سالک اس پیغام کی وضاحت دیتے ہوئے ایسا مؤقف اختیار کرتے ہیں جو صدر یحییٰ کے حامی جرنیلوں کو تو قصوروار ٹھہرانے کو تیار ہے مگر ڈھاکہ میں مقیم جرنیلوں کو اس سے بری الذمہ قرار دے دیا۔

ان کے اس نقطہء نظر کے مطابق جو احکام اور ہدایات دی جاتی تھیں اس میں مغربی پاکستان کی اعلیٰ عسکری قیادت شامل تھی۔ بگڑتی ہوئی صورتحال سے نمٹنے کے لیے صدر یحییٰ نے بھٹو کو ڈھاکہ بلایا۔ حالات کی سخت کشیدگی میں بھٹو تشریف لائے مگر عوامی لیگ کے قائد مجیب الرحمٰن، صدر پاکستان اور صدر پی پی پی کے درمیان کوئی سیاسی حل طے نہ پا سکا۔ نتیجتاً صدر پاکستان جس خاموشی سے ڈھاکہ آئے تھے اس سے بھی زیادہ پراسرار انداز میں واپس لوٹ آئے اور حکم صادر کر دیا گیا کہ ان کے پہنچنے سے پہلے کاروائی کا آغاز ہو۔ عسکری حکام کے افسران بالا کی حیثیت سے یہ انہیں زیب نہیں دیتا تھا۔ یوں ایک ایسی فوجی کاروائی کا آغاز ہوا جس کے بعد ہم کبھی متحدہ پاکستان کی خوشحالی نہ دیکھ سکے۔

میں ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا کا دوسرا حصہ اس **خانہ جنگی** کا بیانیہ ہے جس کو تاریخ میں کبھی اچھے لفظوں میں یاد نہ کیا گیا۔ اس حصے میں ۲۵ مارچ سے لے کر ۳ دسمبر تک کی خانہ جنگی کا ذکر ملتا ہے۔ صدیق سالک نے اس میں آپریشن سرچ لائٹ I اور II کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ صدیق سالک دبے لفظوں میں فوجی ایکشن پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

باہر جتنا سکوں تھا میرے لندر اتنا ہی زیادہ طلاطم تھا میں سوچنے لگا یہ خوشگوار رات خون کی ہولی کھیلنے کے لیے قطعاً نامناسب ہے۔[۸۱]

صدیق سالک جہاں ایک طرف فوجی کاروائی کو نامناسب خیال کرتے ہیں وہیں اس کاروائی کے نتائج کا دفاع کرتے بھی نظر آتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ:

یونیورسٹی سے نکل کر میں شہر کے مختلف حصوں میں چلا گیا راستے میں کبھی فٹ پر اور کبھی گلی کے کسی موڑ پر مجھے اکا دکا لاش نظر آئی۔ لاشوں کے وہ انبار جن کے قصے میں نے بیرونی اخبارات میں پڑھے مجھے کہیں نظر نہ آئے۔[۸۲]

صدیق سالک نے یونیورسٹی کیمپس میں ان گڑھوں کو بھی دیکھا تھا جن میں بے کفن لاشے تھے۔ ان کے مطابق یونیورسٹی کے دو بڑے ہال جگن ناتھ ہال اور اقبال ہال کی عمارتیں خراب ضرور ہوئیں مگر جوں کی توں کھڑی تھیں۔ سرمیلا بوس نے اپنی کتاب *Dead Reckoning* میں بہت سے عینی شاہدین اور عسکری حکام بالا کے واقعات اور انٹرویو سے مواد درج کیا ہے۔ جس میں بہت سوں نے ہلاکتوں اور فوج کی کاروائی کے متعلق بیان دیا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر فوجی کاروائی کی گئی تھی تو اس کی نوبت کیوں آئی؟ کیا یونیورسٹی واقعی باغیوں کا اکھاڑا بن چکی تھی؟ اور کیا فوج کی طرف سے ہونے والی ہلاکتیں واقعی اتنی تھیں جتنی غیر ملکی اخبارات بتا رہے تھے۔ صدیق سالک نے بیرونی اخبارات کے بیان کی تردید کی ہے. جس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غیر ملکیوں کو ڈھاکہ سے روانہ کر دیا گیا تھا جس کے بدلے کی صورت میں ان صحافیوں نے مشرقی پاکستان میں فوج کا کردار اس قدر مسخ کر کے پیش کیا جس کی صفائی میں اگر بولا جاتا تو نہ ۱۹۷۱ء میں کوئی یقین کرتا نہ اب۔ مغربی پاکستان کو مشرقی حصے میں ہونے والی خانہ جنگی سے آگاہ نہ کرنا بھی فوج کے کردار کو مشکوک کرتا چلا گیا۔ کسی بھی فیصلے کی اہمیت کا درست وقت ہوتا ہے اور تاریخ گواہ کہ ہم نے اس کا ازالہ اپنا مشرقی بازو دے کر ادا کیا تھا۔

ایسی بہت سی شہادتیں اور کتب موجود ہیں جو بنگالیوں کی لکھی گئی ہیں اور جو اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ انہوں نے نہ صرف ملکی سلامتی کو داؤ پر لگایا بلکہ آزاد بنگلہ دیش کے قیام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ جہاں آرا امام کی ڈائری اکہتر کے وہ دن اس کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ جہاں ان کا بیٹا رومی ایک ایسا حقیقی کردار ہے جسے بنگالی شہید اور پاکستانی غدار کہتے ہیں۔ جہاں آرا کی ڈائری یہ ثابت کرتی ہے کہ رومی اور اس جیسے نوجوان فوج اور حکومت کے خلاف جنگی و عسکری کاروائیوں میں ملوث تھے وہ مکتی باہنی سے تربیت حاصل کرتے اور آزاد بنگلہ چاہتے تھے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کے روز جہاں آرا امام اپنے بیٹے رومی سے گفتگو کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ:

رومی کے چہرے پر دو تین دن کی بڑھی ہوئی داڑھی ہے۔ سر کے بال نوچ کر رومی نے کہا: امی آپ کو سمجھ کیوں نہیں آتی۔ یحییٰ مجیب بات کی ناکامی یقینی ہے۔ وہ ہمیں آزادی نہیں دینا چاہتے۔ آزادی ہمیں چھین کر لینا پڑے گی۔ مسلح جدوجہد کے ذریعے۔[۸۳]

رومی اور اس جیسے بہت سے کردار اس بات کے غماز تھے کہ مکتی باہنی نے ان کی ذہنی و جسمانی تربیت میں کوئی کمی نہیں رکھی تھی۔ صدیق سالک نے یونیورسٹی پر ہونے والے فوجی ایکشن میں ہلاکتوں کی تعداد کا ذکر نہیں کیا ہے۔ سرمیلا بوس بہت سی شہادتوں کے ذریعے سے ہلاکتوں کی تعداد بتاتی ہیں دیکھا جائے تو اگر ہلاکتیں ہوئیں تو ان کی تصدیق اور تعداد کے لیے بنگلہ دیش کے حامیوں نے کچھ کیوں نہ کیا۔ سرمیلا بوس اس حوالے سے اپنی کتاب میں لکھتی ہیں کہ:

ممکن ہے کہ کھدائی کے نتیجے میں اتنی بڑی تعداد میں لاشیں نہ نکلتیں جتنی بنگالیوں نے بتائی تھیں۔ یہ امکاں موجود کہ چند ایسے افراد کی شناخت ہو جاتی جو یونیورسٹی کے طلبا تھے ہی نہیں، ان باتوں سے قومیت پرستی کو تو دھچکا لگ سکتا ہے۔ لیکن تاریخ صحیح رخ پر ہمارے سامنے آجاتی۔[۸۴]

صدیق سالک نے اگر فوجی دفاع کا رویہ اپنایا تو احتساب کا عمل بھی نہیں چھوڑا تھا۔ فوجہ کاروائی کے بعد وہ ایسے افسران کو بھی اپنے مشاہدہ کے دائرہ کار میں رکھے ہوئے تھے کہ جن کی انجانی حس نے اس فوجی ایکشن سے سکون پایا تھا۔ صدیق سالک اس اطمینان کی فضا کو بھی بیان کرتے ہیں جو عسکری اہل کاروں کے لہجوں میں عیاں تھی۔ لکھتے ہیں:

کیپٹن چودھری نے کینو چھیلتے ہوئے کہا: "بنگالیوں کو خوب سبق سکھا دیا گیا ہے۔ کم از کم ایک نسل تک تو سر نہیں اٹھائیں گے،" میجر ملک نے گرہ لگائی: "جی ہاں، ان کی تاریخ شاہد ہے کہ وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں۔[۸۵]

ڈھاکہ میں کی گئی کاروائی سے حالات صرف اس علاقے میں قابو میں آئے تھے۔ صدیق سالک چٹاگانگ، کشتیا، پنبہ کے حالات کا مختصراً احوال بیان کرتے ہیں اور وہاں کی صورتحال کا جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ان علاقوں میں بنگالیوں کی طرف سے شدید مزاحمت ہوئی تھی۔ فوج کا کافی جانی و مالی نقصان ہوا تھا اس میں بہت سے عوامل کا عمل دخل تھا۔ اول تو فوج منصوبہ بندی اور اسلحہ جات کی شدید کمی کا شکار تھی اور ان کے مقابلے میں مکتی باہنی اور بنگالی بھارت کے تربیت یافتہ تھے۔ دوم مغربی پاکستان کی فوج بنگلہ دیش کے جغرافیہ اور علاقوں سے اس طرح واقف نہ تھی جیسے مقامی بنگالی اور مکتی باہنی واقف تھے۔ یہ ایک بہت بڑا سبب تھا جس نے ہمیں عسکری شکست کی

طرف دھکیلا تھا۔ سوم باغی فوجیوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ وہ ہر حال میں آزاد بنگلہ دیش کا قیام چاہتے تھے۔ ان کی بھارتی حکام کی سرپرستی میں باقاعدہ تربیت کی گئی تھی، جس سے فوج کے مورال کو بھی نقصان پہنچا تھا۔ کیوں کہ ان کے مدمقابل قوت ان سے کہیں زیادہ تھی اور جدید اسلحے سے لیس تھی۔

صدیق سالک چوں کہ آئی۔ایس۔پی۔آر(ISPR) کے شعبہ سے منسلک تھے۔ اس لیے جنگی کاروائیوں کا آنکھوں دیکھا حال بہت زیادہ نہیں ملتا تھا۔ مگر مختلف علاقوں کے واقعات دیگر فوجی افسران کی زبانی یا ریکارڈ کے مطابق بیان کرتے ہیں یوں وہ بالواسطہ وبلاواسطہ دونوں انداز میں متاثر ہو کر اپنا تجربہ اور مشاہدہ پیش کرتے ہیں یہاں اپنی آنکھوں سے دیکھے گئے شر پسندوں کے فسادات کا بھی ذکر کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کا بھی جن پر دونوں طرف سے ظلم ہوا تھا جو یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ فوج ہمیں کیوں مار رہی ہے اور بنگالی کیوں۔ صدیق سالک ۲۶ مارچ کو ڈھاکہ سے غیر ملکی نامہ نگاروں کے نکالے جانے کو بھی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کیوں کہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے پاک فوج کا کردار پوری دنیا میں مسخ کر دیا اور اس کا ازالہ ہم آج تک نہیں کر سکے۔ پاک فوج پر قتل وغارت اور آبروریزی کے جن واقعات کا الزام تھا اس کا تناسب ہمیشہ بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا جبکہ صدیق سالک صرف نو ایسے واقعات کا ذکر کرتے ہیں مگر ان کے نزدیک ایسا ایک واقعہ بھی پوری فوج کو شرمندہ کر دینے کیلئے کافی تھا۔ بنگالی اور غیر ملکی اخبارات نے لاکھوں کے حساب سے جو وارداتیں بتائیں وہ اتنی کبھی نہ تھیں اور جو چند واقعات ہوئے ان کے مرتکب فوجیوں کو عبرتناک سزائیں ملیں۔ لکھتے ہیں:

> ان سزاؤں سے رسوائی کا داغ نہ دھویا جاسکا۔ مجھے ایسے واقعات کی مجموعی تعداد کا اندازہ نہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ایسا ایک واقعہ بھی پوری فوج کو رسوا کرنے کے لیے کافی تھا۔[۸۶]

واقعات کو تسلسل سے لے کر چلتے ہوئے صدیق سالک جنرل نیازی کی ڈھاکہ آمد اور جنرل ٹکا خان کے بعد ان کی بطور ایسٹرن کمانڈر تعیناتی کا ذکر کرتے ہیں۔ یہاں وہ جنرل نیازی کی شخصیت کے حوالے اسے ان باتوں کا ذکر بھی کرتے ہیں جس سے ان کے کردار کے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ صدیق سالک کے مطابق جنرل خادم راجہ نے انہیں بتایا تھا کہ جب وہ فوج کی کمان ان کے سپرد کر چکے تو جنرل نیازی نے پوچھا کہ اپنی داشتاؤں کا چارج کب دو گے؟ یہ باتیں جنرل نیازی کا بہت مسخ کردار پیش کرتی ہیں۔ صدیق سالک ان کی جنگی صلاحیتوں کے متعلق بھی کہتے ہیں کہ انہوں نے جھوٹے دعوے کیے تھے۔ سالک ان کو بطور انسان اور جنگی کمانڈر اخلاقی طور پر قابل تحسین نہیں پاتے ہیں۔ صدیق سالک کہتے ہیں کہ:

قوم کو دھوکہ دینے والے یحیٰی خان واحد شخص نہ تھے۔ جنرل نیازی اس میدان میں ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ انہوں نے متعدد بار اعلان کیا۔ اگر جنگ چھڑ گئی تو میدان کارزار بھارت کی سرزمیں بنے گی۔[۸۷]

جنرل نیازی جنھیں دنیا ٹائیگر نیازی کے نام سے جانتی ہے اپنی کتاب میں نے ہتھیار کیوں ڈالے میں صدیق سالک کی اس بات کی تردید کرتے ہیں۔ ان کے مطابق صدیق سالک میں اس قدر جرات نہ تھی کہ وہ بھٹو کے خلاف کچھ کہتے جو اِن کو ہمالیہ جتنے بڑے فسادات کے ذمہ دار تھے۔ جب کہ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ ان کیسز جن پر جنرل نیازی کا کورٹ مارشل ہو سکتا ہے کے متعلق لکھتی ہے کہ:

وہ بدعنوانی کے بھی مجرم قرار دیئے جاتے ہیں ایک اعلیٰ فوجی افسر اور سینئر کمانڈر ہونے کے باوجود وہ غیر اخلاقی اور رسوا کن جنسی حرکات کے علاوہ مشرقی پاکستان سے پان کی سمگلنگ میں بھی ملوث تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ بر آمد ہوا کہ ان کے ماتحت افسران کے دل میں ان کا کوئی احترام اور عزت باقی نہ رہی۔[۸۸]

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا یہ بیان صدیق سالک کی کہی گئی بات کی کسی حد تک تائید کرتا ہے۔ جنرل نیازی کی آمد کے کچھ دن بعد یعنی مئی کے ماہ تک حالات نارمل ہو گئے تھے مگر یہ وقت سیاسی تصفیے کا تھا جو مغربی پاکستان کے حکمرانوں اور سیاستدانوں نے ریشہ دانیوں میں اور مشرقی پاکستان کے باغیوں نے بھارت کے زیر نگرانی تربیت میں گزارا تھا۔ بھارت نے روس سے جو دفاعی معاہدہ کیا تھا اس سے حاصل ہونے ولا اسلحہ پاکستان کو توڑنے میں استعمال کیا گیا تھا۔ یہاں پاکستانی ہائی کمانڈ اس زعم میں ماری گئی کہ وہ دنیا کی بہترین فوج ہیں اور جنگیں جذبوں سے لڑی جاتی ہیں اسلحے سے نہیں۔ زمینی حقائق کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت جسے بیرونی طاقتوں کا بھی تعاون حاصل تھا وہاں جذبوں کے ساتھ ساتھ اسلحے کی بھی ضرورت تھی۔ ناقص منصوبہ بندی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔

کتاب کا تیسرا حصہ **جنگ** پر مبنی ہے جس میں صدیق سالک بھارت کے ساتھ باقاعدہ جنگ کے واقعات اور پاک فوج کے حالات کو بیان کرتے ہیں۔ ایک دفاعی تجزیہ نگار کی حیثیت سے انہوں نے اس تمام جنگی صورتحال کو پیش کیا ہے۔ وہ پاک فوج کی اس جنگ میں مختلف حالتوں کو بیان کرتے ہیں، اس جنگی صورتحال کو بیان کرنے کے لیے انہوں نے اس حصے کو مختلف سیکٹرز کے حوالے سے نام دے کر تفصیل لکھی ہے۔ جس میں جیسور سیکٹر، کومیلا سیکٹر، ناٹور سیکٹر برہمن باڑیہ سیکٹر، چاندپو سیکٹر میمن سنگھ سیکٹر وغیرہ۔ بھارت جیسی طاقت جو پاکستان کا ازلی دشمن بھی

تھاجب پاک فوج کے مقابلے میں آیاتواس کی دفاعی طاقت کئی گنازیادہ تھی۔ان سب حالات کے باوجود پاکستانی فوج نے بہت ہمت اور جرات کا مظاہرہ کیا۔اگر جنگی منصوبہ بندی درست انداز میں تشکیل دی گئی ہوتی تو عین ممکن تھا کہ حالات ونتائج اس کے برعکس ہوتے۔اسی جنگی حکمت عملی سے متعلق صدیق سالک لکھتے ہیں کہ:

> کہاجاتاہے کہ وسائل کی کمی کو جنرل کا ذہن پوراکر دیتاہے مگر اس میدان میں بھی ہماری عزت جنرل نیازی جیسے آدمی کے ہاتھ میں تھی۔[۸۹]

جنرل نیازی اپنی کتاب میں نسے ہتھیار کیوں ڈالسے میں شکست کے عوامل کو بیان کرتے ہوئے موسمی حالات، افواج کی تعداد، مقامی حالات و معاملات، تعداد اور وسائل کا ٹھیک اندازہ، گولہ بارود کی فراہمی اور ایسی ہی دیگر وجوہات پر نظر ڈالتے ہوئے کہتے ہیں، ان کے نزدیک کسی بھی فوجی کی قسمت ان سب چیزوں سے وابستہ ہوتی ہے۔اس ضمن میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ نے کچھ اس انداز میں بیان دیا کہ:

> ہم نے سپلیمنٹری رپورٹ میں واقعات کی جو تفصیلات دی ہیں ان سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ منصوبہ بندی انتہائی مایوس کن تھی اور ڈھاکہ کے دفاع کا کوئی منصوبہ ہی نہیں تھااور نہ ہی کوئی ایسی کوشش کی گئی کہ دشمن کے حملے کو کہیں بھی ایک ڈویژن یا بریگیڈیئر کے ساتھ جنگ لڑ کر روکا جائے۔[۹۰]

صدیق سالک اور جنرل نیازی کے بیانات کا تقابل کرنے کے بعد اس کی تصدیق میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ صدیق سالک نے جنرل نیازی کی جنگی حکمت عملی کے متعلق درست معلومات مہیا کی ہیں۔ان کا یہ عسکری تجزیہ شواہد کی بناپر درست تھاوہ جنگی فلسفے کو مد نظر رکھتے ہوئے جنرل نیازی کی اس پالیسی کو غلط قرار دیتے ہیں کہ فوج کو تسبیح کے دانوں کی طرح بکھیر دیاجائے اور پھر فتح کی امید رکھی جائے ان کے مطابق جنرل نیازی نے اپنی صلاحیتوں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کیا تھا۔صدیق سالک نے بحریہ اور فضائی فوج کی طاقت اور ان کی کاروائیوں کا بھی جائزہ لیاہے۔مشرقی پاکستان کا علاقہ جو اپنی موسمی اور جغرافیائی نوعیت کے اعتبار سے جنگ کیلئے ساز گار نہیں تھااور وہ بھی ایک ایسی فوج جو مغربی پاکستان کے موسم اور جغرافیہ کی پیداوار تھی ان کیلئے قطعاًنامناسب تھا۔دفاعی قوت ووسائل اور حکمت عملی کے فقدان نے باقی کام تمام کر دیا تھا۔

صدیق سالک کے مطابق بحریہ صرف ۴۸ گھنٹوں تک اپنا کردار ادا کر سکی تھی اس کے بعد وہ صرف نقل و حمل کے کام آئی اور ۶ دسمبر کو ہوئی اڈوں کی تباہی نے فضائیہ کو بھی بے کار کر دیا تھا گو کہ فضائیہ نے بھارتی وروسی جدید طیاروں کا مقابلہ نہایت دلیری سے کیااور تاریخ کا سب سے زیادہ ایمونیشن ایک دن میں استعمال ہوا مگر ان چند

طیاروں اور ایک رن وے پر کب تک اکتفا کیا جاسکتا تھا۔ یوں لے دے کر صرف بری فوج ہی بچتی تھی۔ اس بری فوج کا تفصیلاً ذکر کرتے ہوئے صدیق سالک نے شجاعت اور بزدلی دونوں کے قصوں کو مد نظر رکھا ہے۔ ایک غیر جانبدار تجزیہ نگار اور عسکری مشاہدہ کار کی حیثیت سے انہوں نے فوجی کاروائی کا بغور جائزہ لیا۔ مثلاً جیسور سیکٹر کے بریگیڈیئر محمد حیات کی فوجی کاروائی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو بریگیڈیئر حیات نے یہ پرائیویٹ جنگ بڑی مہارت سے لڑی اور وہ دشمن کا ایک ڈویژن اپنے تعاقب میں دولت پور تک لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔[۹۱]

اس کے علاوہ کرنل فضل حمید، کمانڈر گل زریں، بریگیڈیئر منظور نے بھی مزاحمت کے بغیر دفاعی انداز اپنایا اور علاقہ خالی کرکے پیچھے ہوتے رہے۔ چاند پور سیکٹر کے لیفٹیننٹ کرنل زیدی، لیفٹیننٹ کرنل اشفاق سید اور لیفٹیننٹ کرنل نعیم نے عین جنگ میں ۱۶ دسمبر سے پہلے ہی ہتھیار ڈال دیئے تھے اور بھارتی قید میں چلے گئے تھے۔ اس کے ساتھ صدیق سالک نے بہادری اور دلیری کی مثالیں پیش کرکے وہ روشن رخ بھی دکھانے کی کوشش کی ہے جہاں سپاہیوں اور افسران نے دشمن کو کمال جرات سے روکے رکھا۔ میجر محمد اکرم نے اپنی دفاعی پوزیشن اس انداز میں ترتیب دی تھی کہ وہ دونوں طرف سے دشمن پر حملہ کرسکتا تھا یوں انہوں نے بہت دلیری سے دشمن کو روکے رکھا اور جام شہادت نوش کیا۔ میجر اکرم کو بعد از شہادت نشان حیدر عطا کیا گیا۔ اسی طرح سے صدیق سالک نے حکم داد کی بہادری کو بھی خراج تحسین پیش کیا جس نے اپنے افسر کے حکم کے باوجود حملہ جاری رکھا اور دشمن نے اسے مورچے میں آکر ختم کیا۔ اسی طرح میمن سنگھ سیکٹر کے میجر محمد ایوب کی ہمت کی داد دیتے ہیں جو پوسٹ پر کمک پہنچانے کی کوشش میں شہید ہوئے۔

صدیق سالک جنگی ناکامی کے ضمنی اسباب کا ذکر کرتے ہوئے ان نیم عسکری تنظیموں کے افراد کا ذکر کرتے ہیں جنھیں باقاعدہ تربیت نہ دی گئی تھی اور جو فوج کے ہراول دستوں میں سے تھے غیر تربیت یافتہ نفری کا اگلی صف میں ہونے سے فوج کے موارل پر اثر پڑا کیوں کہ ان کے قدم اکھڑتے ہی دیگر نفری بھی جان بچانے پر زیادہ توجہ دینے لگ گئی۔ فوج کے اس رویے کی بڑی وجہ اعلیٰ قیادت کا رویہ تھا جب افسران پسپائی کے وقت کا تعین کرنے لگ گئے تھے۔ یہاں صدیق سالک اپنے پیش کردہ معتوب کردار کی ایک اور جھلک پیش کرتے ہیں۔ جنرل نیازی جو بلند بانگ دعوے کرتے تھے کہ آخری آدمی، آخری گولی تک لڑیں گے اور ڈھاکہ میں داخل ہونے سے پہلے دشمن کو ان کی لاش پر سے ٹینک گزارنا ہو گا، جنگ کے چوتھے دن ہی وہ گورنر عبد المالک کے سامنے ہچکیاں لے کر رو رہے

تھے۔ صدیق سالک اس واقعے کے عینی شاہد نہیں تھے مگر چائے لے جانے والے بنگالی بیرے نے یہ خبر عام کر دی تھی۔ اس واقعے کے بارے میں صدیق سالک رقم طراز ہیں کہ:

> انہوں نے کہنیاں اپنی میز پر گاڑھ رکھی تھیں اور سر دونوں ہاتھوں کے پیالے میں رکھا ہوا تھا باہر سے آنے والے کو چہرہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا اس لیے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس وقت واقعی رو رہے تھے۔ البتہ ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اس جملے سے ہوتا ہے جو انہوں نے اس موقع پر مجھے کہا انہوں نے فرمایا سالک! شکر کرو کہ تم آج جرنیل نہیں ہو۔ [۹۲]

صدیق سالک نے آخری دنوں میں جنرل نیازی اور گورنر مالک کی طرف سے جنرل یحییٰ کو لکھے جانے والے خطوط کا متن بھی درج کیا ہے۔ جس کے مطابق جنرل یحییٰ نے ان حالات میں فیصلے کی ذمہ داری گورنر مالک اور جنرل نیازی پر ڈال دی تھی۔ گورنر مالک نے حالات کو دیکھتے ہوئے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے نمائندوں کو اقتدار منتقل کرنے اور بھارتی اور پاکستانی افواج کی واپسی کی تجویز دی۔ یہ مراسلہ صدر کے نام لکھا گیا تھا اور اقوام متحدہ کے نمائندے کو بھی اس کی نقل دی گئی۔ اس کو اس بنا پر رد کر دیا گیا کہ حکام بالا چین اور امریکہ سے امداد کے انتظار میں تھے۔ نہ امریکہ کا بحری بیڑہ سچ ہوا اور نہ چین نے اس جنگ میں کود ناپسند کیا دوسری طرف بھٹو اقوام متحدہ میں عالمی حمایت حاصل کرنے میں مصروف تھے۔ یہاں صدیق سالک بھٹو کے حوالے سے پولینڈ کی قرارداد جو بھٹو کو دی گئی تھی اس کے پھاڑنے کا ذکر نہیں کرتے ہیں۔ اس میں ان کی کون سی سیاسی مصلحت پوشیدہ ہے یہ وہی جانتے تھے۔ جنرل نیازی نے بھارتی چیف آف سٹاف مانک شاہ کے نام پیغام میں تحفظات کے ساتھ جنگ بندی کی پیشکش کی۔ مانک شاہ نے وہ پیش کش اس شرط پر قبول کی کہ پاکستانی فوج ہتھیار ڈالے، آخر کو ازلی دشمن تھے ذلت کا کوئی موقع وہ کیسے ضائع کرتے۔ جنرل نیازی نے ماتحت افسروں کو جنگ بندی کی ہدایت کر دی۔ رمنا ریس گراونڈ میں جنرل جگجیت سنگھ اروڑا اور جنرل نیازی نے جنگ بندی کی دستاویز پر دستخط کر دیئے اور ملکی تاریخ کے چہرے پر وہ کالک ملی جو کبھی دھوئی نہیں جا سکتی۔

آخر میں سالک نے کلکتہ میں جنرل نیازی سے لیا گیا انٹرویو شامل کیا ہے جس میں صدیق سالک کے سوالات کے جواب میں جنرل نیازی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکے۔ ان کے مطابق ۹۳۰۰۰ (۹۳ ہزار) بیواؤں کو واپس لے جانے سے بہتر تھا کہ وہ ۹۳۰۰۰ (۹۳ ہزار) قیدی لے کر جائیں مگر تاریخ ان کے اس عمل کو معاف نہیں کر سکتی ہے۔ عوام میں جنرل نیازی کے متعلق جتنی نفرت تھی سعید الدین اپنی کتاب مشرقی پاکستان کا زوال میں لکھتے ہیں:

کاروائی کا آغاز ہوا جنرل نیازی نے اطمینان سے جنرل اروڑہ کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے معاہدے پر
دستخط کیے اپنے شانے پر سے سٹار نوچے اپنا ریوالور اور پیٹی اتار کر اپنی کار کی طرف پھینکے اتنے میں
کوئی شخص ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے زور سے جنرل نیازی کے سر پر جوتا دے مارا۔ [۹۳]

یوں ڈھاکہ واقعتاً ڈوب گیا۔ صدیق سالک نے آخر میں چار ضمیمے درج کئے ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کتاب ایک فوجی تاریخ کو سمیٹے بہت سے حقائق سے پردے اٹھاتی ہے۔ شریف فاروق صدیق سالک کے حوالے سے لکھے گئے ایک مضمون سحر افروز مسکراہٹ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

غالباً یہ حقیقت ایک بڑے انکشاف کی حیثیت رکھے گی کہ میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا کے انگریزی
ایڈیشن وٹنس ٹو سرنڈر بنگلہ دیش کی یونیورسٹیوں میں ایم اے کے کورس میں شامل ہے۔ [۹۴]

زندہ قومیں ہمیشہ احتساب کا دروازہ کھلا رکھتی ہیں سقوطِ ڈھاکہ کا دکھ ہماری تاریخ کا وہ داغ ہے جو دھویا تو نہیں جاسکتا مگر اس کا تجزیہ کر کے ملک کو دوبارہ ایسے حادثے سے بچایا جاسکتا ہے۔

صدیق سالک کی لکھی گئی آپ بیتی سیلوٹ ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آئی۔ بیس ابواب پر مشتمل یہ کتاب ان کی عسکری زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے۔ کتاب کا آغاز پہلے باب میں ان کے خاندانی، معاشی و معاشرتی پس منظر سے ہوتا ہے۔ اپنی تعلیمی زندگی، تدریس کے پیشے سے وابستگی، گاؤں کے بزرگوں سے دلی وابستگی، فوج میں شمولیت اور افسری ٹھاٹھ باٹھ جیسے موضوعات سے ہوتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ شائستہ اور کسی حد تک مزاحیہ انداز میں وہ اس آپ بیتی کو لے کر چلتے ہیں۔ افسری زندگی کے دلچسپ واقعات اور فوجی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ ۱۹۶۵ء کی جنگ کو بھی پیش کرتے ہیں۔ اس سب میں انھوں نے سیاست و فوج کی اہم شخصیات اور دیگر اہم کرداروں کی نفسیات کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ کتاب کا مجموعی اسلوب سنجیدہ ہے مگر مزاح کا عنصر بھی ملتا ہے۔ فوج میں شراب کا بے جا استعمال اور اصولوں کے خلاف سرعت سے ترقی پر بھی حیرت کا اظہار کیا ہے۔

کتاب کا دسواں باب جنرل یحییٰ خان کا مارشل لا کے عنوان سے ہے۔ جب ملک میں دوسرا مارشل لا لگا کر یحییٰ خان اقتدار پر قابض ہو چکے تھے اور ایوب خان اپنا بوریا بستر گول کر چکے تھے۔ صدیق سالک اس واقعے کا ذکر کرتے ہیں جب انھوں نے سخت طوفانی بارش میں ریڈیو ٹیم کو ساتھ لے جا کر یحییٰ خان کی تقریر ریکارڈ کی۔ صدیق سالک کے مطابق اس وقت جب انہیں اے۔ ڈی۔ سی کے کمرے میں پہنچایا گیا تو وہاں شراب کا دور چل رہا تھا۔ سالک اس واقعے کی عینی شاہد ہیں لکھتے ہیں:

یوں برستی بارش میں شراب سے شرابور کمانڈر انچیف نے اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کر دیں اور میں نے مارشل لاء لگنے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اگلے روز تقریر نشر ہو گئی اور ملک دوسری بار مارشل لاء کے آکسیجن ٹینٹ میں داخل ہو گیا۔[۹۵]

گیارھویں باب ایوب، یحییٰ، اسحاق میں صدر یحییٰ کا جو کردار پیش کیا وہ در حقیقت فیلڈ کمانڈر کا تھا جو سالک کے مطابق ڈنڈا گھماتا ہے اور فیصلہ صادر فرماتا ہے۔ مثلاً کسی نے کہا:

سر دو سیاستدان شیخ مجیب اور ذوالفقار علی بھٹو دونوں بیک وقت وزیر اعظم بننا چاہتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا بنا دو۔[۹۶]

یہ ایک فرضی مثال تھی مگر شاید اسی رو میں بہتے ہوئے وہ ۱۹۷۱ء میں پہنچ گئے۔ اس باب کے بعد جہاں بھی سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے واقعات، مشاہدات، حالات، تجزیے پیش کیے گئے ہیں صدیق سالک نے نہایت واضح موقف کے ساتھ انہیں بیان کیا ہے۔ قیام ڈھاکہ، سقوط ڈھاکہ اور اسیری بھارت کے حوالے سے جن واقعات اور شخصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اس آپ بیتی کو جگ بیتی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

بارھواں باب **مشرقی پاکستان: پہلا تاثر** کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں سرسری انداز میں مشرقی پاکستان کے لوگوں کی مغربی پاکستانیوں کیلئے نفرت کا ذکر کرتے ہیں۔ مغربی پاکستانیوں کا تحکمانہ رویہ بھی چھوٹے موٹے واقعات کے ذریعے سے پیش کرتے ہیں۔ وہاں کی غربت کی عکاسی کے ساتھ وہاں کے لوگوں کے نفرت آمیز رویے کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ صدیق سالک کے مطابق انہیں برابری کا درجہ نہ ملنا اس کی بڑی وجہ تھی۔ آخر میں معاشرتی اور سیاسی فضا کا تجزیہ اس انداز میں کرتے ہیں:

ایک مہینے کے اندر اندر مجھ پر واضح ہو گیا کہ ہم پاکستان کے ایک حصے میں نہیں ہیں بلکہ کسی دیار غیر میں ہیں جہاں کے مقامی باشندے ہمیں دیکھ کر خوش نہیں ہیں۔ پاکستان اندرونی طور پر بٹ چکا ہے، صرف خول کو کاٹنے کی دیر ہے۔[۹۷]

تیرھواں باب **مشرقی پاکستان: آخری ضرب** میں صدیق سالک پاکستان کی دگرگوں صورتحال، محکومانہ اور تحکمانہ رویوں کی مزید مثالیں دی ہیں۔ سالک کے بقول بنگالیوں سے ان کے تعلقات محبت کے تھے اس کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

اس خیر سگالی میں میرا کوئی کمال نہ تھا، دراصل وہ بڑے محبت کرنے والے لوگ تھے، اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہو گا کہ وہ محبت کے پیاسے تھے۔ اگر ان کی محبت کا جواب محبت سے دیا جاتا تو وہ بچھ جاتے اور اگر ان سے رعونت اور بالادستی کا مظاہرہ کیا جائے تو وہ بچھو بن جاتے تھے۔[98]

یعنی صدیق سالک ان کے رویوں کا ذمہ دار اپنے آپ کو اور دیگر مغربی پاکستانیوں کو گردانتے ہیں۔ اس باب میں جنگ کا مختصر ذکر بھی ملتا ہے۔ جنرل نیازی کو چکن پلیٹ تھامے گندے لطیفے سناتے دیکھ کر سپاہیوں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ ایسا تھا کہ ایسے سالار کے بھیجے پیغام پر نہ جانا شہادت کے لالچ میں کہیں جان سے ہی ہاتھ نہ دھونا پڑے۔ یہاں سالک سوالیہ انداز میں پوچھتے ہیں کہ ایسے کمانڈر کی کمان کون کر سکتا ہے جو سپاہیوں کا اعتماد ہی حاصل نہ کر سکے۔ باب کے آخر میں جنرل نیازی جنھیں ٹائیگر کہا جاتا تھا کو گیدڑ سے تشبیہ دیتے ہیں جو متحدہ پاکستان کی جنگ ہار گئے لکھتے ہیں:

بالآخر جنرل نیازی نے ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ہتھیار ڈال دیے۔ جیم کا نقطہ سنگینوں سے کرید کر نکال دیا گیا اور بھارت نے مشرقی پاکستان کا حج سے حلوہ بنا دیا۔[99]

چودھواں باب **صاحبزادہ یعقوب، ٹکا اور نیازی** جس میں ان تینوں شخصیات کے متعلق صدیق سالک نے بہت واضح انداز میں اپنی رائے دی ہے۔ صدیق سالک جنرل یعقوب کی شخصیت کے مداح تھے، اس کی ایک وجہ جو صدیق سالک کے انداز تحریر سے محسوس ہوتی ہے کہ وہ سالک کو کافی پسند کرتے تھے۔ سالک کے مطابق انہوں نے سیاسی صورتحال کو سنبھالے رکھا مگر ٹکا خان کی آمد نے حالات کو مزید ابتری کی جانب دھکیل دیا، اور رہی سہی کسر ان کے فوجی ایکشن نے پوری کر دی لکھتے ہیں:

میں نے یہ خوفناک رات جنرل ٹکا خان اور اُس کے ساتھیوں کے ساتھ آنکھوں میں گزاری۔ میرے سامنے ڈھاکہ یونیورسٹی سے شعلے بلند ہوئے، میرے سامنے وائرلیس پر مزید طاقت استعمال کرنے کے آرڈر پاس ہوئے اور میرے سامنے مجیب الرحمٰن کو رات کے ایک بجے کے قریب سفید کرتے پاجامے میں گرفتار کر کے لایا گیا۔[100]

جنرل ٹکا خان کی مخلصی اور ایمانداری کا معترف ہونے کے باوجود صدیق سالک نے اس فوجی کاروائی کی بناء پر انہیں ہمیشہ ہدفِ تنقید بنایا، یہ بہر حال تاریخ کا حصہ ہے۔ صدیق سالک کے ذمہ چونکہ ملکی و غیر ملکی اخبارات کے حوالے سے خبریں چھپوانا تھا اس لئے وہ نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں ان قومی و بین الاقوامی خبروں کو پیش کرتے تھے اور ان کے مطابق جنرل نیازی اچھی خبریں سننا زیادہ پسند کرتے تھے بہ نسبت کڑوی اور سچی خبروں کے۔

پندرھویں باب کا نام **فلیگ سٹاف ہاؤس** ہے جو ڈھاکہ میں عسکری افسر اعلیٰ کی رہائش گاہ کا نام ہے۔ سالک اس سے وابستہ اپنی یادوں کو بیان کرتے ہوئے چار شخصیات کا ذکر کرتے ہیں۔ صدیق سالک اس عمارت کے اندرونی انتظام وانصرام کی منظر کشی ان چاروں شخصیات کے حوالے سے بہت خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں۔ اس رہائش گاہ میں چاروں جرنیلوں کے رہائش کے دور میں مختلف انداز نظر آیا۔ جنرل یحییٰ کے ذکر میں گھر کا اندرونی ماحول نہیں پیش کیا گیا۔ البتہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۱ء کو ان کی خاموش روانگی کا نقشہ کچھ اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

> اُس شام مشرقی پاکستان میں آرمی ایکشن کا حکم دینے کے بعد جنرل یحییٰ خان ہمیشہ کے لئے مغربی پاکستان چلے آئے تھے اور وہ بھی ایسے رازدارانہ انداز میں جیسے کوئی تخریب کار کسی عظیم الشان عمارت میں ڈائنامائٹ رکھ کر بھاگ جاتا ہے۔ [۱۰۱]

جنرل یعقوب صدیق سالک کی محبوب شخصیت کے روپ میں سامنے آتے ہیں اور یہ ایک ایسا حقیقی کردار ہے جس کی سحر انگیز شخصیت اور نفاست کی داد صدیق سالک نے بہت خوبصورت انداز میں دی ہے۔ اس کے بعد جنرل ٹکا خان کے زیرِ استعمال اس رہائش گاہ کا ذکر ٹکا خان کی شخصیت کے حوالے سے کرتے ہیں۔ گھر کی اگلی یاد جنرل نیازی سے وابستہ ہے جس کی بنیاد پر وہ اس گھر کو اب مسافر خانے سے تشبیہ دے کر بیان کرتے تھے۔ جنرل نیازی کی شخصیت کا مضحکہ خیز پہلو جو ان کی مونچھوں سے متعلق تھا اس کو بیان کرنے کے بعد سقوط ڈھاکہ سے اس کو جوڑتے ہوئے کہتے ہیں:

> ان جھوٹی مونچھوں کے سہارے اگلے آٹھ ماہ تک ہمیں جھوٹی تسلیاں دیتے رہے اور کہتے رہے کہ اگر بھارت نے مشرقی پاکستان پر بھرپور حملہ کرنے کی حماقت کی تو میں آپ کو کلکتہ لے جاؤں گا۔ دسمبر ۱۹۷۱ء میں بھارت نے یہ حماقت کر ڈالی اور جنرل نیازی ہمیں کلکتہ لے گئے فاتح کے طور پر نہیں جنگی قیدی کی حیثیت سے (اگر جنگی قیدی کی کوئی حیثیت ہوتی ہے تو)۔ [۱۰۲]

سولھویں باب کا عنوان **بھارت کے بندی خانے** ہے۔ اس میں اسیری کے دور کی سرگزشت ہے جو تفصیل سے اپنی کتاب ہم یاراں دوزخ میں بیان کر چکے ہیں۔ اس باب میں وہ Interrogation Cell میں گزاری تین ماہ کی زندگی کی تکلیف کو دو سال کی قید کے برابر قرار دیتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے ہتک آمیز رویے کو حقیقت پسندانہ انداز میں واضح کر کے بیان کرتے ہیں۔ نیز ان حالات میں ایمان کی طاقت کو اپنی ہمت کا واحد سہارہ قرار دیتے ہیں۔ قید تنہائی کے بعد انہیں سنٹرل جیل آگرہ بھیج دیا گیا تھا۔ مجموئی طور پر قید کی شدت محسوس ہوتی تھی مگر وہاں دیگر دوستوں کے ہونے کی وجہ سے ایک مسرت کا احساس ساتھ رہتا تھا۔ دوران قید انہوں نے انسانی نفسیات کا جس

گہرائی سے مطالعہ کیا وہ ایک نہایت تلخ تجربہ ہے اور ایک ایسا انسان جو اس دوزخ میں رہا ہو اس سے بہتر اس عالم کو کوئی بھی نہیں بیان کر سکتا۔ لکھتے:

> قید بڑی ظالم شے ہے یہ انسان کو بالکل ننگا کر دیتی ہے۔ ہر لحاظ سے ننگا! جسمانی لحاظ سے بھی اور اخلاقی لحاظ سے بھی۔۔۔۔۔ آپ پیاز کے چھلکے اور نلکے کے پانی پر جھگڑا کرنے سے لے کر ملکی مسائل کے بارے میں رد عمل سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کون کتنے پانی میں ہے۔[۱۰۳]

آخر میں ہندوؤں کی اس حماقت کا ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے پاکستانی قیدیوں کے ساتھ برا سلوک روا رکھ کر سرانجام دی تھی۔ صدیق سالک کے خیال میں اگر وہ چاہتے تو ان ۹۳۰۰۰ (۹۳ ہزار) قیدیوں کو اچھے سلوک سے ۹۳۰۰۰ (۹۳ ہزار) سفیروں میں بدل سکتے تھے مگر وہ ہمیشہ سے ایک متعصب قوم رہی ہے۔ اس کے ساتھ صدیق سالک پر امید انداز میں وطن واپسی کے لئے دعا بھی کرتے ہیں۔

سترھویں باب کا عنوان **کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ** ہے۔ اس باب میں وطن واپسی کے بعد ملکی صورتحال کا جائزہ لیتے ہیں کہ سقوط ڈھاکہ سے ہم نے کیا سیکھا۔ عسکری و سیاسی صورتحال انہیں بے چین رکھتی تھی اگر وہ ایک آرمی افسر تھے تو ایک ادیب بھی تھے جو حساس دل کا مالک ہوتا ہے۔ ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء کو محمد ریاض اختر، فیض علی چشتی سے انٹرویو لیتے ہیں۔ فیض علی چشتی (سابق وفاقی وزیر) سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے کہتے ہیں:

> سانحہ مشرقی پاکستان سے ہم نے صرف ذلت اور رسوائی حاصل کی ہے۔ افسوس ہم اس دل کش واقعے سے کچھ بھی سبق نہ پا سکے۔ کسی کو اس بات کا احساس نہیں کہ آدھا ملک ہم سے الگ کیوں ہوا؟ یہ تاریخ کا اعلان ہے کہ حکمرانوں نے عوام کو جمہوری حق نہیں دیا۔[۱۰۴]

صدیق سالک کے نزدیک یہ ایک سیاسی مسئلہ تھا جسے فوجی طاقت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی۔ پوری قوم نے اس کے نتائج بہت برے انداز میں دیکھے۔ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے صدیق سالک نے مختصراً اس کتاب میں احوال بیان کئے مگر ان میں بھی اپنی سیاسی بصیرت، ادبی شخصیت اور عسکری تجزیہ نگاری کا بالکل درست انداز میں استعمال کیا۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ کا ایک ایسا موڑ جس نے ملک کو دولخت کر ڈالا، بہت سے ادیبوں کے افسانوی و غیر افسانوی ادب کا موضوع رہا ہے۔ ہر ادیب نے اپنے تجربات، خیالات، پیش آئے واقعات اور حقائق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس سانحے کو اپنی تحریروں میں جگہ دی۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک کی زیرِ بحث غیر افسانوی نثر بھی سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے بہت سے حالات و واقعات کو سامنے لاتی ہے۔ یہ دونوں شخصیات اپنے فرائض

کی ادائیگی کے سلسلے میں ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان میں موجود تھیں۔ مسعود مفتی بحیثیت بیوروکریٹ (وزیرِ تعلیم) اور صدیق سالک عسکری ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے ڈھاکہ میں تعینات تھے۔ مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے کی داستان غم کا بیان دونوں نے اپنے مخصوص اسلوب میں پیش کیا۔ مسعود مفتی کی زیرِ بحث تصانیف ہم نفس، لمحے، چہرے اور مہرے اور صدیق سالک کی تحریریں ہمہ یاراں دوزخ، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، سیلوٹ مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے کے حوالے سے ادبی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ دونوں شخصیات کی تحریریں ابتدا سے اختتام تک ایک تسلسل اور روانی کو برقرار رکھے ہوئے ملتی ہیں۔ واقعات کو ایک ایسی زمانی ترتیب دے کر پیش کیا گیا ہے کہ قاری کے لئے حالات و واقعات کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔ انہوں نے حتی الامکان کوشش کی کہ حالات و واقعات کو تاریخ وار بیان کریں تاکہ تحریر کا ربط برقرار رہے۔ یوں ایک مربوط انداز بیان سے دونوں شخصیات کی تحریریں مزین ہیں۔

مسعود مفتی اور صدیق سالک کا جنگ سے پہلے کے حالات، جنگی واقعات اور اس کے قیامت خیز نتائج سے جہاں تک براہ راست تعلق رہا انہوں نے ان واقعات کو من و عن پیش کیا، مگر اپنے پیشے کی نوعیت کے اعتبار سے جن واقعات تک رسائی ممکن نہ تھی انہیں قابل بھروسہ عینی شاہدین کی زبانی بیان کیا ہے۔ یوں ان کی تحریریں بلا واسطہ اور بالواسطہ اثر پذیری کا امتزاج ہیں۔ واقعات کو پیش کرنے میں جہاں تک حقیقت نگاری اور منظر نگاری کا عمل دخل تھا اس پہلو کو بھی مکمل سچائی کے ساتھ قلم بند کیا گیا۔ دل دہلا دینے والے مناظر، قتل وغارت اور تباہی و بربادی کے واقعات کا بیان حقیقت کے اس قدر قریب ملتا ہے کہ قاری کے سامنے ان دل سوز واقعات کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک نے اپنی آنکھوں دیکھے واقعات جو کہیں سیاسی اور زیادہ تر عرصہ جنگ سے قبل، بعد از جنگ اور دوران جنگ پر مبنی تھے کو حقائق کے ساتھ پیش کیا۔ یہاں دونوں شخصیات کی ہندوستانی جیلوں میں قید تنہائی کاٹنے کی قدر بھی مشترک ہے۔ دورانِ قید بھارتی حکام اور عملے کے رویے، پاکستانی قیدیوں سے ناروا سلوک اور قید میں پیش آنے والے واقعات کا مختصر مگر جامع جائزہ بھی ان کی تحریروں کا حصہ ہے۔ یہاں بھی زمانی ترتیب اور واقعات کے تسلسل کو ملحوظِ خاطر رکھا تاکہ تحریر کی روانی برقرار رہے۔

تمام حالات و واقعات اور مناظر میں حقائق اور دلائل کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ مسود مفتی اور صدیق سالک محب وطن پاکستانی تھے۔ ایک سرکاری عہدیدار ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے پہلو میں ایک حساس ادیب کا دل بھی دھڑکتا تھا جو ہمیشہ وطن کی محبت سے سرشار رہا۔ یہی جذبہ حب الوطنی ان کے قلم کو کبھی ملک کی

محبت کے جذبات کا بیان کرنے سے نہ روک سکی۔ وطن سے جدائی کا دکھ اور ایک آزاد ریاست کی اہمیت سے وابستہ ان کی دلی کیفیات بھی وقتاً فوقتاً ان کی تحریروں میں جھلکتی ہیں۔ یہاں ایک ادیب کا قلم ان جذبات کا مکمل طور پر آئینہ دار بن جاتا ہے جو وطن سے دور دشمن کی قید میں کسی بھی پاکستانی کے ہو سکتے ہیں۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر میں بیان کردہ واقعات اپنے اندر جن حقیقی کرداروں کو سمیٹے ہوئے ہیں، ان میں کچھ کرداروں نے روشن ستارے اور کچھ نے ملکی تاریخ کا سیاہ باب بن کر وطن کو داغدار کیا۔ زیر بحث دونوں ادیبوں نے حساس معاملات کے علاوہ جہاں تک ممکن ہوا ان سیاسی و عسکری شخصیات کا مکمل عکس پیش کرنے کی کوشش کی جو کسی بھی طرح سے پاکستان کی تاریخ اور جغرافیہ بدلنے میں شامل رہے تھے۔ صدر یحییٰ خان، مجیب الرحمٰن، ذوالفقار علی بھٹو، جنرل نیازی اور لطف الرحمٰن عرف بھولا جیسے مرکزی کرداروں کے علاوہ چند ذیلی کردار بھی ان کی تحریروں کا حصہ رہے ہیں۔ مسعود مفتی کی نسبت صدیق سالک کی تحریروں میں سیاسی و عسکری کرداروں کا جائزہ ذرا تفصیلاً پیش کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ غالباً ان کا زیر تنقید شخصیات کو مسعود مفتی کی نسبت قریب سے جاننا تھا۔ دونوں شخصیات نے کردار نگاری میں غیر جانبدارانہ انداز بیان برقرار رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

جہاں دیگر تمام پہلوؤں کو موقع کی مناسبت سے زیرِ بحث لایا گیا وہیں مسعود مفتی اور صدیق سالک نے واقعات کی پیش کش میں ان عوامل کی بھی ساتھ ہی نشاندہی کی جو ملکی سلامتی کو ختم کرنے میں سرِ فہرست تھے۔ انہی عوامل میں قومی سطح پر کی گئی غلطیوں اور کوتاہیوں کے ضمن میں اپنا اور قوم کا احتساب بھی شامل کیا۔ یہ احتسابی عمل اس قربِ الٰہی کی وجہ سے زیادہ بہتر رخ اختیار کر گیا جو دورانِ قید دونوں شخصیات کو حاصل ہوا تھا۔ یہ وہ احتساب ہے جو آج بھی ہمیں کٹہرے میں بلاتا ہے اور ہم سے جوابدہ ہے کہ گزرے سالوں میں ہم نے کیا سیکھا۔ کیا ملک کا دولخت ہونا اتنا معمولی واقع ہے کہ قومیں اس کے بعد بھی احتسابی عمل سے نہ گزریں؟

اس سوال کا جواب شاید تاریخ یا ملک کا مستقبل دے گا۔ ملکی تاریخ میں مسعود مفتی اور صدیق سالک کا نام سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے ہمیشہ معتبر رہے گا۔ ملکی تاریخ کے بدلنے کے یہ عینی شاہدین اپنی تحریروں سے قوم کو اصل حقائق سے واقفیت دلاتے رہیں گے۔

حوالہ جات

۱۔ مسعود مفتی، لمحے،(اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)،ص۱۵۔۱۶۔

۲۔ ایضاً،ص۱۸۔

۳۔ مقصودہ حسین،ڈاکٹر، مسعود مفتی: شخصیت اور فن، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص۱۱۲۔

۴۔ مسعود مفتی، لمحے،ص۱۸۔

۵۔ ایضاً،ص۲۰۔

۶۔ ایضاً،ص۳۳۔

۷۔ ایضاً،ص۳۴۔

۸۔ ایضاً،ص۲۱۔

۹۔ ایضاً،ص۶۳۔

۱۰۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، ص۴۷۔

۱۱۔ مسعود مفتی، لمحے،ص۶۵۔

۱۲۔ ایضاً،ص۴۱۔

۱۳۔ ایضاً،ص۲۶۔

۱۴۔ ایضاً،ص۲۹۔

۱۵۔ ایضاً،ص۲۳۔

۱۶۔ ایضاً،ص۳۵۔

۱۷۔ ایضاً،ص۱۱۱۔۱۱۲۔

۱۸۔ ایضاً،۱۲۱۔

۱۹۔ ایضاً،ص۱۲۴۔

۲۰۔ مسعود مفتی،ہم نفس،(لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۶ء)، ص۴۶۔

۲۱۔ ایضاً، ص۵۳۔

۲۲۔ ایضاً، ص۵۱۔

۲۳۔ محمد اشفاق خان، حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ، ص۲۶۶۔

۲۴۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۹۵۔

۲۵۔ صفدر محمود، پاکستان کیوں ٹوٹا، (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء)، ص۱۰۸۔

۲۶۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۸۱۔

۲۷۔ محمد اشفاق خان، حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ، ص۵۷۴۔

۲۸۔ ایضاً، ص۷۹۱۔

۲۹۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۱۱۶۔

۳۰۔ ایضاً، ص۱۴۷۔

۳۱۔ امیر عبداللہ خان نیازی، لیفٹیننٹ جنرل، میں نے ہتھیار کیوں ڈالے، ترتیب وتدوین وسیم شیخ (لاہور: فیکٹ پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء)، ص۱۰۱۔

۳۲۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۵۶۔۵۷۔

۳۳۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور (۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء)۔

۳۴۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء)، ص ۲۵۔

۳۵۔ ایضاً، ص۲۹۔

۳۶۔ ایضاً، ص۴۸۔

۳۷۔ ایضاً، ص۵۳۔۵۴۔

۳۸۔ محمد اشفاق خان، حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ، ص۹۶۶۔

۳۹۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے، ص۶۶۔

۴۰۔ ذوالفقار علی بھٹو، عظیم المیہ، (لاہور: حاجی حنیف پرنٹرز، ۲۰۱۳ء)، ص۱۰۶۔

۴۱۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے، ص۱۰۷۔

۴۲۔ ایضاً، ص۶۳۔

۴۳۔ محمد اشفاق خان،حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ،ص۱۰۲۱۔

۴۴۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے،ص۱۸۷۔۱۸۸۔

۴۵۔ ظہور احمد اعوان،ڈاکٹر، داستان تاریخ رپوتاژ نگاری ،(پشاور:صدر ادارہ علم و فن پاکستان، ۱۹۹۹ء)،ص۱۲۷۔۱۳۷۔

۴۶۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، (لاہور: آر۔ آر۔ پرنٹرز، ۲۰۱۶ء)،ص۲۳۔

۴۷۔ ایضاً،ص۳۰۔

۴۸۔ ایضاً،ص۸۳۔

۴۹۔ ایضاً،ص۴۴۔

۵۰۔ ایضاً،ص۶۵۔

۵۱۔ ایضاً،ص۷۶۔

۵۲۔ شریف فاروق، "سحر افروز مسکراہٹ" مشمولہ نوائے وقت میگزین (لاہور: ۹ ستمبر ۱۹۸۸ء)،ص۹۔

۵۳۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ،ص۱۰۷۔

۵۴۔ سید مقبول حسین،کرنل،کیمپ ۳۵،(راولپنڈی:حرف اکادمی،۲۰۰۵ء)،ص۵۱۔

۵۵۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ،ص۱۱۶۔

۵۶۔ ایضاً،ص۱۲۲۔

۵۷۔ ایضاً،ص۱۸۱۔

۵۸۔ ایضاً،ص۱۸۰۔

۵۹۔ ایضاً،ص۲۲۳۔

۶۰۔ ایضاً،ص۲۲۲۔

۶۱۔ ایضاً،ص۲۰۵۔

۶۲۔ ایضاً،ص۳۷۔

۶۳۔ ایضاً،ص۶۸۔

۶۴۔ سید ضمیر جعفری، "طلسمی مندری والی کتاب" مشمولہ کتابی چہرے،(راولپنڈی: مکتبہ نیرنگ خیال،۱۹۸۹ء)، ص۱۷۴۔

۶۵۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ،ص۴۷۔

۶۶۔ ایضاً،ص۲۵۴۔

۶۷۔ ایضاً،ص۱۸۔۱۹۔

۶۸۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا،(لاہور:الفیصل پرنٹرز،۲۰۱۷ء)،ص۱۴۔

۶۹۔ ایضاً،ص۱۳۔

۷۰۔ ایضاً،ص۱۱۔

۷۱۔ سرمیلا بوس، ڈھاکہ کہانی کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی *(Dead Reckoning Memories of the Bangladesh War 1971)*، مترجم نذر حسین کاظمی(لاہور:اظہار پرنٹرز، ۲۰۱۳ء)،ص۳۔

۷۲۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا،ص۱۹۔

۷۳۔ ایضاً، ص۷۹۔

۷۴۔ سرمیلا بوس، ڈھاکہ کہانی کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی *(Dead Reckoning Memories of the Bangladesh War 1971)*،ص۲۶۔

۷۵۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا،ص۵۰۔

۷۶۔ ایضاً،ص۵۱۔

۷۷۔ ایضاً،ص۶۰۔

۷۸۔ شریف الحق دالیم،لیفٹیننٹ کرنل ، پاکستان سے بنگلہ دیش ان کہی جدوجہد، مترجم رانا اعجاز احمد،(لاہور:جمہوری پبلی کیشنز ،۲۰۱۶ء)،ص۹۸۔

۷۹۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا،ص۸۱۔

۸۰۔ محمد اشفاق خان،حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ،ص۶۴۹۔

۸۱۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا،ص۱۰۲۔

۸۲۔ ایضاً، ص۱۰۷۔

۸۳۔ جہاں آرااامام، اکہتر کے وہ دن، مترجم منور مہدی،(لاہور: جمہوری پبلی کیشنز ،۲۰۱۰ء)، ص۴۹۔

۸۴۔ سرمیلا بوس، ڈھاکہ کہانی کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی *(Dead Reckoning Memories of the Bangladesh War 1971)*، ص۸۷۔

۸۵۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۱۰۸۔

۸۶۔ ایضاً، ص۱۴۰۔

۸۷۔ ایضاً، ص۱۵۴۔

۸۸۔ محمد اشفاق خان،حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ، ص۳۹۷۔

۸۹۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۱۷۶۔

۹۰۔ محمد اشفاق خان،حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ، ص۴۲۱۔

۹۱۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۱۸۶۔

۹۲۔ ایضاً، ص۲۴۲۔

۹۳۔ سعید الدین،مشرقی پاکستان کا زوال،(لاہور: آئینہ ادب،۱۹۸۰ء)، ص۹۴۔

۹۴۔ شریف فاروق ،"سحر افروز مسکراہٹ"مشمولہ نوائے وقت میگزین (لاہور: ۹ ستمبر ۱۹۸۸ء)، ص۹۔

۹۵۔ صدیق سالک،سیلوٹ،(لاہور: محبوب پرنٹرز،۲۰۱۷ء)، ص۱۱۱۔

۹۶۔ ایضاً، ص۱۱۹۔

۹۷۔ ایضاً، ص۱۲۹۔

۹۸۔ ایضاً، ص۱۳۱۔

۹۹۔ ایضاً، ص۱۴۱۔

۱۰۰۔ ایضاً، ص۱۴۷۔

۱۰۱۔ ایضاً، ص۱۵۴۔

۱۰۲۔ ایضاً، ص۱۵۹۔

۱۰۳۔ ایضاً، ص۱۶۶۔

۱۰۴۔ محمد ریاض اختر، "سانحہ مشرقی پاکستان سے ہم کچھ نہ کچھ سیکھ سکے "مشمولہ نوائے وقت (لاہور: ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء)، ص۷۔

باب سوم:

سقوطِ ڈھاکہ کے متعلق نظریاتی مباحث کا تقابلی جائزہ

نظریات ہماری اس مستحکم سوچ کی عکاسی کرتے ہیں جس کے نتیجے میں ہم عملی طور پر کچھ کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ دورانِ مطالعہ یہی نظریات قاری کو ان واقعات سے جوڑتے ہیں جو مصنف کی زندگی کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ یوں ادیب معاشرے کا ایک ایسا فرد بن کر اُبھرتا ہے جس کی سوچیں، خیالات اور نظریات صرف اُس کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتے بلکہ وہ ایک قوم کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہر ادیب اپنے نظریات کی بنیاد اپنی زندگی میں پیش آنے والے واقعات پر رکھتا ہے۔ یہ اُس کی ذات، خیالات اور احساسات پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ ان نظریات کو کس زاویہ نگاہ سے پیش کرے گا۔ کہیں یہ نظریات ہمیں تاریخی شواہد سے پردہ اُٹھاتے نظر آتے ہیں تو کہیں مستقبل کی پیش گوئیوں پر مبنی ملتے ہیں۔ تاریخی واقعات سے وابستہ نظریات نہ صرف تاریخ بلکہ ادب کیلئے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

سقوطِ ڈھاکہ ایک ایسا تاریخی سانحہ ہے کہ جس کے متعلق بہت سے ادیبوں نے اپنے خیالات و نظریات کا اظہار کیا۔ یہ اظہار کہیں ڈھکے چھپے انداز میں تو کہیں کھلم کھلا قاری کی سوچوں کے در وا کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ان شخصیات کے نظریات زیادہ قابل توجہ ہیں جو اس تاریخی سانحے کے عینی شاہدین ہیں۔ اس ضمن میں مسعود مفتی اور صدیق سالک کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ان دونوں شخصیات نے اپنے فرائض کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ ان حالات و واقعات کو بھی قلم بند کیا جو موجودہ دور کے قاری کو ۱۹۷۱ء کے سانحے کی سچائی سے روشناس کرواتے ہیں۔ یہاں وہ نظریات قابل غور ہیں جو ان کے ذاتی مشاہدات، تجربات اور پیش آئے واقعات کے نتیجے میں قائم ہوئے ہیں۔ یہ نظریات عسکری اور قومی سطح پر نہایت اہمیت کے حامل کے ہیں۔

مسعود مفتی وزیر تعلیم کی حیثیت سے اور صدیق سالک آئی۔ایس۔پی۔آر(ISPR) کے شعبے سے وابستہ تھے۔ دونوں کو عسکری امور کی انجام دہی کے سلسلے میں مشرقی پاکستان بھیجا گیا۔ ان دونوں کی تحریریں بیان و اسلوب اور واقعات کی پیش کش کے اعتبار سے ایک حسین امتزاج ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ سیاسی، عسکری، ثقافتی، تعلیمی، معاشی و معاشرتی مسائل اور حالات کے متعلق ان دونوں کے نظریات بھی قابل توجہ ہیں۔ زیر نظر باب میں دونوں شخصیات کے ان نظریات کا تقابلی جائزہ لینا مقصود ہے جو پیشے کے اعتبار سے ان ادیبوں کی سوچ کو واضح کریں گے۔ یہ

نظریات قاری کیلئے ایک نتیجہ خیز تجزیہ قائم کرنے میں معاون ہیں۔ کہیں اختلاف اور کہیں یکسانیت کا رنگ ان نظریات کی روشنی میں سقوطِ ڈھاکہ کے الم ناک سانحے کی گتھیاں سلجھانے کی کوشش کرے گا۔ زمینی حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے اور اپنے پیشے کی قائم کردہ حدود میں رہتے ہوئے جہاں تک ممکن ہوا ان دونوں شخصیات نے اپنے نظریات کو درست انداز میں قوم تک پہنچانے کی کوشش کی۔ مسعود مفتی وزیر تعلیم تھے اس لحاظ سے ان کے دائرہ کار میں جو شخصیات شامل تھیں اور جو حالات و واقعات انہیں پیش آئے اس کا تجزیہ بخوبی کیا گیا۔ اسی طرح سے صدیق سالک نے عسکری شخصیات، جنگی حالات و واقعات اور عسکری و سیاسی حکام بالا کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت کے مطابق اپنے نظریات پیش کیے ہیں۔ اہم مسائل اور واقعات کے ساتھ ساتھ انہوں نے اُن سیاسی و عسکری موضوعات کو بھی اپنے نقطہ نظر سے واضح کیا جن کی کڑیاں مل کر سقوط ڈھاکہ کا پیش خیمہ بنیں۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے حوالے سے مسعود مفتی گہری بصیرت رکھتے ہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ پاکستان بننے کے بعد سے ہی ہماری سیاست کن ریشہ دوانیوں کا شکار رہی ہے۔ مشرقی پاکستان سے جغرافیائی دوری اور درمیان میں ازلی دشمن بھارت کی موجودگی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ یوں ہماری سیاسی تاریخ میں سقوطِ ڈھاکہ ایک ایسے باب کی صورت میں شامل ہو گیا جو ہمیشہ ورق پلٹنے پر پاکستانی قوم کو احساس شرمندگی سے دوچار کرتا ہے۔ ملک جتنی مشکلات اور قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا تھا اُس کو قائم رکھنے اور ترقی کی راہ پر گامزن کرنے میں اُسی قدر مشکلات کا سامنا رہا۔ ملکی تاریخ کے نہ ختم ہونے والے مسائل کو مسعود مفتی نے مختصراً اس انداز میں بیان کیا ہے:

> پاکستان کی تواریخ کے تمام المیے اس ایک رویے سے پھوٹے ہیں کہ قائد اعظم کے بعد جو بھی حاکم آیا اس کا دائمی مقصد اپنا اقتدار رہا ہے۔ یہ خواہشِ اول، یہی خواہشِ آخر، اِس ہوس نے برسوں ملک کا دستور نہ بننے دیا۔ بنا تو اس پر عمل نہ ہونے دیا۔ جمہوریت کو تہ تیغ کیا۔۔۔ عوام کو دانستہ تعلیم سے محروم رکھا اور ایک صحت مند ملک کو بیمار جاگیر کا درجہ دے دیا۔۔۔ اتنے مختلف حاکم مگر سب کا رویہ واحد۔۔۔ حاکموں کا اگر یہ رویہ نہ ہوتا تو وطن کی تواریخ مختلف ہوتی۔[1]

مسعود مفتی کی سیاسی بصیرت سے یہ بات پوشیدہ نہیں تھی کہ وطن عزیز نے کتنے سیاسی طوفانوں کو جھیلا تھا۔ وہ کون سے عوامل تھے جو صرف ۲۴ برسوں میں ملک کو توڑ کر چل نکلے تھے۔ تحریک پاکستان میں جس مشرقی پاکستان کا سب سے فعال کردار رہا تھا اُس نے کیسے اپنی الگ دنیا بسائی تھی؟ دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کیسے دولخت ہوئی تھی؟ یہ سب باتیں مسعود مفتی جیسے حساس ادیب کی نگاہوں سے چھپی ہوئی نہیں تھیں۔ سقوط ڈھاکہ کے

حوالے سے اپنی غیر افسانوی نثر میں جہاں تک ممکن ہوا مسعود مفتی نے حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے درست انداز میں اپنے نقطہ نظر کو پیش کیا۔ امجد اسلام امجد اس حوالے سے کہتے ہیں:

> سقوطِ ڈھاکہ ہماری تاریخ کا وہ الم ناک باب ہے جو نہ صرف ہماری نسل بلکہ آئندہ آنے والی نسلوں کیلئے بھی ایک مبہم تصویر کی طرح ہے جسے لوگ مزید اُلجھاتے چلے جا رہے ہیں۔ مسعود مفتی ان منتخب اہلِ نظر صاحبانِ قلم میں سے ہیں جنہوں نے ان دھندلے شیشوں کو اُجالنے کی بھرپور اور کامیاب کوشش کی ہے۔[۲]

صدیق سالک نے اپنی غیر افسانوی نثر میں جہاں مکمل جنگی صورتحال کو بیان کیا وہیں سیاسی معاملات کے وہ پہلو بھی زیرِ بحث لائے جو پاکستان کی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ اپنی عسکری و سیاسی بصیرت کے پیشِ نظر واقعات کے تجزیے میں اپنا نقطہ نگاہ بھی شامل کرتے ہیں۔ یوں ان کی خود نوشت، رپوتاژ اور تاریخ ایک قومی سرمایے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اپنی غیر افسانوی نثر میں سیاسی و عسکری حکام کے عمل، فیصلوں اور معاملات پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ صدر یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو اور عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن کے متعلق جو بھی نظریہ قائم کیا وہ براہ راست ملاقات کی بنیاد پر کیا یا ٹھوس شواہد و حقائق معلوم کرنے کے بعد کیا۔ سیاست دانوں اور جرنیلوں کی ملاقاتیں ملکی مفادات کو کس طرح متاثر کر رہی تھیں اس سب سے بھی صدیق سالک کی ذات لاتعلق نظر نہیں آتی ہے۔ اس سلسلے میں صدر یحییٰ خان اور ذوالفقار علی بھٹو کی لاڑکانہ میں ہونے والی ملاقات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> مجھ جیسے افراد جن کا تعلق براہ راست عوامی لیگ سے تھا، نہ پی پی سے، یہ سمجھتے تھے کہ اگر مسٹر بھٹو، یحییٰ خان کی میزبانی کا شرف حاصل کیے بغیر ڈھاکہ تشریف لے جاتے تو فضا اتنی مکدر نہ ہوتی۔ اس "میزبانی" کے جو اثرات ڈھاکہ میں مرتب ہو رہے تھے اُن کا یا تو مسٹر بھٹو کو علم نہ تھا یا وہ جان بوجھ کر ایسی فضا قائم کرنا چاہتے تھے جس میں افہام و تفہیم کی بجائے شکوک و شبہات کو زیادہ دخل حاصل ہو۔[۳]

۱۹۷۱ء کی جنگ کے حوالے سے صدیق سالک کی رائے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اُن کا تعلق افواجِ پاکستان سے تھا اور ملکی سلامتی کی راہ میں حائل رکاوٹوں میں بھی بہت سوں کا تعلق فوج سے تھا۔ اس بنیاد پر اُن کا تجزیہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ مگر یہاں چند افراد کی کوتاہی کے ضمن میں ساری فوج کو مورد الزام ٹھہرانا درست نہیں ہو گا اور صدیق سالک اسی نظریے کے تحت ان عسکری حکام کو ہی مجرم گردانتے ہیں جو قصور وار تھے۔ ان کے خیال میں ہر

ملک کی فوج اندرونی و بیرونی خطرات سے محفوظ رہنے کیلئے اقدامات کرتی ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا وہ دوسرے ممالک کے خلاف عزائم کیلئے تیار ہے۔ یہاں صدیق سالک غیر ملکی مصنفین کے بیانات کی تردید بھی کرتے ہیں جو ساری فوج کو ایک ہی لاٹھی سے ہانک رہے تھے۔ لکھتے ہیں:

> بعض غیر ملکی مصنفین کا یہ استدلال سراسر بے بنیاد ہے کہ جب صدر یحییٰ خان ایوانِ صدر میں سیاسی حل کیلئے کوشاں تھے، ڈھاکہ میں موجود جرنیلوں نے انہیں فوجی کاروائی پر مجبور کیا۔ اگر بعض جرنیلوں کی طرف سے اُن پر ایسا دباؤ تھا تو یہ یحییٰ خان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے جرنیلوں کی طرف سے ہو گا۔ ڈھاکہ میں مقیم جرنیلوں کا اندازِ فکر مختلف تھا۔[4]

صدیق سالک کا یہ انداز قصور وار اور بے قصور افسران میں ایک حد فاضل بھی قائم کرتا ہے جو قاری کو یہ سمجھانے کی کوشش تھی کہ فوجی افسران میں صرف چند لوگ ہی ذاتی مفادات کو اہمیت دے رہے تھے۔ صدیق سالک نے ذاتی طور پر ان بیانات کی تردید کی ہے جو افواہوں کی صورت میں کہیں غیر ملکی تجزیہ نگاروں تو کہیں باغیوں نے عام کر رکھے تھے۔ ایک ادیب کی حیثیت سے ان کی بے لاگ رائے ان کی فرض شناسی کی دلیل ہے۔ صدیق سالک نے غیر ملکی مبصرین کی پھیلائی گئی افواہوں کی تردید کی اور حقائق کو مد نظر رکھتے ہوئے اُس کی وجہ بھی بیان کی۔ ہر وہ خبر جو متعلقہ یا غیر متعلقہ ذرائع سے ان تک پہنچی اس کی مکمل تصدیق اور اعداد و شمار کی درستی کے بعد اس کو قلم بند کیا گیا۔ بالکل اسی طرح جنگی حالات کے دوران قتل و غارت کے اعداد و شمار سے متعلق اپنی رائے کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> اگر غیر ملکی ذرائع ابلاغ عامہ نے اعداد و شمار بڑھا چڑھا کر بیان کیے ہیں تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہیں راولپنڈی میں بیٹھے ہوئے "اربابِ عقل و دانش" نے ۲۶ مارچ کو مشرقی پاکستان سے نکال دینے کا حکم دیا تھا۔ ان میں سے اکثر صحافی کلکتہ جا کر بیٹھ گئے جہاں وہ سیاحوں کی غیر متعلقہ خبروں اور بھارتی حلقوں کے تخمینوں پر انحصار کرنے لگے مجھے یقین ہے کہ اگر اُن صحافیوں کو مشرقی پاکستان میں رہنے دیا جاتا، تو حالات انہیں اتنے گھمبیر نظر نہ آتے جتنے انہوں نے دور بیٹھ کر رنگ آمیزی کر کے دنیا کے سامنے پیش کیے۔[5]

مشرقی اور مغربی پاکستان کہنے کو تو ایک ملک تھا مگر اُس کے باسیوں کی سوچ ہمیشہ سے مختلف انداز میں پروان چڑھی تھی۔ مسعود مفتی نے بنگلہ دیش کے قیام کے دوران وہاں کے لوگوں کی نفسیات کا بہت قریب سے جائزہ لیا تھا۔ جنگ سے قبل کی صورتحال پر بات کرتے ہوئے وہ وہاں کے لوگوں کے رویوں کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ان جیسا

حساس ادیب یہ جانے بنا نہیں رہ سکتا کہ ہمارے مشرقی بھائی کس کس انداز سے ہمیں دیکھتے تھے۔ مسعود مفتی لکھتے ہیں:

> ہر طبقے کے لوگوں کی نظروں میں ہمارے لیے وہ تاثرات تھے جو چھوٹے بھائی کی نظروں میں بڑے بھائی کے لیے ہوتے ہیں۔ گو آبادی کے لحاظ سے مشرقی پاکستان بڑا تھا مگر ترقی کے لحاظ سے مغربی پاکستان آگے تھا اور ہماری خوشحالی کو وہ توقع بھری نظروں سے دیکھتے تھے کہ ہم بھی ان کو ساتھ لے کر آگے بڑھیں گے۔[۶]

تحریک پاکستان میں بنگالی قوم کی بھی بہت سی قربانیاں شامل تھیں۔ یہ مشرقی و مغربی پاکستان کی عوام کی مشترکہ کوششوں کا ثمر تھا۔ مگر ان دونوں خطوں میں پروان چڑھنے والی نسلیں مختلف سیاسی ماحول میں پلی بڑھی تھیں۔ مشرقی پاکستان کی عوام مغربی پاکستانیوں کی نسبت زیادہ باشعور تھیں۔ ملک میں پیدا ہونے والی سیاسی تبدیلیاں انہیں یہ باور کروانے کیلئے کافی تھیں کہ معاملات کیا رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اپنی شناخت کو قائم رکھنے کی فکر ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ مسعود مفتی مغربی و مشرقی پاکستان کے لوگوں کی سوچ اور اس کے پس منظر کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہیں کہ:

> مغربی پاکستان کے لوگ جاگیر دارانہ نظام تلے مسلسل پسنے کی وجہ سے عادتاً اطاعت شعار تھے اور دوسرے اُن کی کئی نسلیں فوجی ملازمت سے روزی کماتی رہی تھیں۔ اس کے برعکس مشرقی پاکستان میں جاگیر داری نظام پیدا ہونے کی وجہ سے وہاں کے شہری خود بین، خود اعتماد، بلند بانگ اور سیاسی طور پر زیادہ بالغ نظر تھے۔[۷]

اس سیاسی بالغ نظری کے باوجود مشرقی پاکستان کی عوام نے تمام حالات کا بہت ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ ان میں بہت سوں نے جنگی صورتحال میں بھی ملکی سالمیت کیلئے بہت سی اذیتیں اور تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو وطن عزیز کی سلامتی چاہتے تھے۔ جن کے آباؤ اجداد اس یقین کے سہارے سب کشتیاں جلا کر پاکستان آئے تھے کہ یہی اب اُن کی کل متاعِ حیات ہے۔ مسعود مفتی جہاں ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی نفسیات سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے وہیں یہ چہرے بھی ان سے پوشیدہ نہیں تھے جن کی مخلصی پاکستان کی جڑوں میں شامل تھی۔ خانہ جنگی نے ہر طرح کے طبقے کو متاثر کیا تھا۔ مرنے والے بھی اپنے تھے اور مارنے والے بھی۔ ایسے میں تاریخ حیران کھڑی تھی کہ اسے کس انداز میں رقم کیا جا رہا ہے۔ ان محب وطن لوگوں سے متعلق لکھتے ہیں:

مارچ کے بعد چیخ چیخ کر بہت کچھ کہتے رہے مگر ان کی ایک نہ سنی گئی اور اس کے باوجود یہ پاکستان کے حق
میں لڑتے رہے۔ ان کو خطوں میں دھمکیاں ملیں، ٹیلیفون پر گالیاں دی گئیں۔ گھروں میں بم پھینکے گئے، سرراہ قتل کیا مگر یہ ڈٹے رہے۔[8]

ملکی تاریخ کے اس الم ناک سانحے میں ایسے عظیم لوگ بھی موجود تھے جن کے پایہ استقلال میں لغزش نہیں آئی تھی۔ ان کی استقامت اور پاکستان سے محبت انہیں عمر کی پرواہ کئے بغیر میدانِ جنگ میں لے آئی۔ ان بلند حوصلہ لوگوں میں آج بھی کچھ لوگ زندہ ہیں اور اسی محبت و حوصلے کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں جو سقوطِ ڈھاکہ کے وقت ان کے دلوں میں موجزن تھا۔ محمد دل شیر علی انصاری نامی ایک عینی شاہد انہی میں سے ایک ہیں۔ جو چٹا گانگ میں رہتے تھے اور ۱۹۷۱ء میں میٹرک کے طالبعلم تھے۔ ہمیں انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ:

میں خود اپنے والدین کو بتائے بغیر فوج میں چلا گیا۔ گھر میں نہیں بتایا۔ آرمی کو ضرورت تھی۔ مکتی باہنی بار بار ہمارے گھر آتے تھے۔ وہ کہتے "تمہارا چھیلا کو تھائے" (تمہارا لڑکا کہاں ہے)۔ والد نے کہا مجھے نہیں پتا۔ کہتے ہم نے سنا وہ فوج میں چلا گیا ہے۔ میرا گھر دو تین دفعہ جلایا۔[9]

محمد دل شیر علی انصاری آج بھی راولپنڈی کی بہاری کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔ وہ لمحات اب بھی انہیں ان گزرے دنوں کی یاد دلاتے ہیں۔ مشرقی حصے میں پیدا ہوئے، جوان ہوئے مگر عمر کا ایک بڑا حصہ مغربی پاکستان میں کاٹا۔ ان کی محبت ان دونوں خطوں کے لئے آج بھی یکساں ہے۔ اس سلسلے میں صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر کا جائزہ لیں تو دیکھا جاسکتا ہے کہ انہوں نے بنگالیوں کی نفسیات کا تجزیہ بہت گہرائی سے کرتے ہوئے ہر اس نقطے کو واضح کرنے کی کوشش کی جو ان کے مطابق لازم تھا۔ ان کا تجزیہ جہاں ایک طرف بنگالیوں کی محبت کے انداز کو ظاہر کرتا ہے وہیں ان متعصب رویوں کو بھی سامنے لاتا ہے جو ملک کی سلامتی کی جڑیں کھوکھلی کر رہے تھے۔ ڈھاکہ میں قیام کے دوران وہاں کے لوگوں کے ساتھ ان کے کافی اچھے مراسم رہے۔ انہی تعلقات کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

وہ بڑے اچھے لوگ تھے، وہ نہ صرف میری بھیجی ہوئی تصویروں اور پریس ریلیز کو صفحہ اول پر جگہ دیتے تھے بلکہ مجھے بھی دل میں بٹھاتے تھے۔۔۔ میرے اُن کے دو طرفہ تعلقات اتنے برادرانہ ہو گئے تھے کہ اُن کی بیویاں گھر پر ننگے پاؤں اور ننگے سر، کاٹن کی ساڑھیاں لہراتی، بھائی شالک کے لیے مچھلی اور چاول پکاتی تھیں۔[10]

یہ محبت کے وہ رنگ تھے جو وہاں کے باسیوں میں صدیق سالک نے دیکھے۔ ان برادرانہ تعلقات کے ساتھ ساتھ تصویر کا ایک اور رخ بھی تھا۔ صدیق سالک نے ایک ایسے واقعے کی مثال بھی پیش کی جو انہوں نے مشرقی پاکستان سے واپس آئے ایک صحافی کی زبانی سُنی۔ یہ ایک مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے فوجی افسر کا واقعہ تھا جس نے بنگالیوں کے دِل جیتنے کیلئے سب سے پہلے بنگلہ زبان سیکھی تھی۔ مگر جب وقت کی گنگا اُلٹی بہتی ہے تو تمام مفاہمتیں پس پشت ڈال کر سب کچھ بہا کر لے جاتی ہے۔ فوجی افسر کے ساتھ پیش آئے واقعے کو صدیق سالک اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ایک مرتبہ وہ چھاؤنی سے شہر جا رہا تھا کہ کچھ مشتعل بنگالی لونڈوں نے اُسے روک لیا اور "پنجابی شالا، پنجابی شالا" کی گردان شروع کر دی۔ اُس نے اُن کی زبان میں اپنی صفائی پیش کرنا چاہی تو انہوں نے اُس کا گریبان پکڑ کر گاڑی سے باہر کھینچ لیا اور غصے سے کہا: "ہم پر حکومت کرنے کو ہمارا بھاشا (زبان) بھی سیکھ لیا۔[11]

یہ تصویر کا وہ دوسرا رخ تھا جو صدیق سالک اپنے قاری کے سامنے لاتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات پر قائم کیے گئے نظریات کے ساتھ ساتھ اُن نکات کو بھی واضح کرتے ہیں جو دیگر لوگوں کی زبانی ان تک پہنچے تھے۔ زبان کے جھگڑے سے متعلق یہ واقعہ بنگالی عوام کی سوچ کا ایک نیا رخ سامنے لاتا ہے۔ یہ مسئلہ ابھی کا نہیں تھا اس نے ۱۹۴۸ء میں ہی سر اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۷۱ء کے عینی شاہد محمد دل شیر علی انصاری نے اس حوالے سے انٹرویو میں بتایا کہ:.

> قائد نے کہا کہ ہم پاکستان کا زبان اردو رکھیں گے چونکہ (مشرقی پاکستان) وہاں اکثریت بنگالی مسلمانوں کی تھی تو اس میں ایک نوجوان نے احتجاج کیا۔ "آمرا راشٹو بھاشا بانگلا چاہی" (ہماری قومی زبان بنگلا ہونی چاہیے)۔[12]

عینی شاہد کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگالی یہ چاہتے تھے کہ ان کی زبان قومی زبان کی حیثیت اختیار کرے۔ اس سلسلے میں ان کا مطالبہ بہت پہلے شروع ہو چکا تھا۔ یہاں مسعود مفتی اس لسانی مسئلے کو مختلف نقطہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اپنے انٹرویو میں انہوں نے لسانی تنازعات کے حوالے سے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ:

> تہذیبی اور لسانی اختلافات محض سطحی تھے اور ان کی وجہ سے کوئی دوری نہ تھی بلکہ پاکستان کے پہلے گیارہ برسوں میں کسی قسم کی دوری کا شائبہ تک نہ تھا اور زبان کے مسئلے پر بھی بھائیوں کے درمیان

خانگی جھگڑے جیسا ماحول تھا لیکن ۱۹۵۸ء کے بعد آنے والے تمام حاکم اپنے اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لیے صوبوں میں دوریاں پیدا کرتے رہے۔[۱۳]

مسعود مفتی نے مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ ہونے والی نا انصافیوں کا پہلو کئی جگہوں پر اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔ بد قسمتی سے مشرقی پاکستان کا خطہ ہمیشہ سے استحصال کا شکار ہوتا چلا آ رہا تھا۔ یہ سرزمین جتنی حسین تھی اتنے ہی تاریخی سانحوں سے بھی اس کا چہرہ سجا تھا۔ مسعود مفتی کا نقطہ نظر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ ان کے نزدیک بڑی سطح پر کی گئی ناانصافیاں ہی در حقیقت خلیج پیدا کرنے کا سبب تھیں۔ اس حوالے سے اپنی ڈائری لمحے میں لکھتے ہیں کہ:

> جب پچھلے پندرہ بیس برس میں مشرقی پاکستان کے بعض لیڈر شور کر رہے تھے کہ ہمارا استحصال ہو رہا ہے تو مرکزی حکومت نہ جانے کن مصلحتوں کی بنا پر خاموش رہی اور یہ نہیں بتایا کہ مشرقی پاکستان کے ترقیاتی کاموں کے اعداد و شمار کیا ہیں اس مجرمانہ خاموشی کا نتیجہ آج ہم بھگت رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان کے لوگ ہم سے بد ظن ہیں اور ہماری اچھی بات کو بھی شک سے دیکھتے ہیں۔[۱۴]

یہ سیاسی چپقلش بڑھتی گئی اور اسی نے ملک کو دولخت ہونے کے سانحے سے دوچار کیا۔ مسعود مفتی کی رپوتاژ کے حقیقی کردار ایک ایسی علامت بن کر اُبھرے ہیں جن سے مشرقی پاکستان کی اکثریت کی سوچ اور کرب کی عکاسی ہوتی ہے۔ یہ وہ درد تھا جس کا بیج اربابِ اختیار نے بویا تھا اور اِس کی فصل عام پاکستانیوں کو کاٹنا پڑی۔ بھولے کا کردار ایک ایسی سوچ کو ظاہر کر رہا تھا جس کو حکمران سمجھنے سے قاصر تھے یا سمجھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اپنے اِس حقیقی کردار کی نفسیاتی حالت کا بیان در حقیقت مسعود مفتی کے بھی نظریات کو واضح کر رہا تھا۔ بگڑے حالات بھولے کی شخصیت کو بہت بُری طرح سے توڑ پھوڑ کا شکار کر رہے تھے۔ اس حالت کو مسعود مفتی اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

> بھولا چپ چپ رہنے لگا تھا گو ملاقات کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ ملک کے حالات کو متعلق بات چیت ہوتی تو یوں لگتا جیسے اسے بے معنی گفتگو سمجھتا ہو جو لاحاصل ہو اور حقیقت سے غیر متعلق ہو۔ ہو اس وفا شعار بیوی کی طرح تھا جسے خاوند کی آوارگی کا علم ہوتا ہے مگر کر کچھ نہیں سکتی مجبوراً نباہ کرتی ہے۔[۱۵]

مسعود مفتی نے بھولے کے کردار کی کیفیت کو ایک ایسی مثال دے کر بیان کیا ہے جو اصل میں پاکستان کی ایک بڑی آبادی کی حالت زار تھی۔ وہ یہ جانتے تھے کہ حکمرانوں اور سیاستدانوں کی کرسی کی کھینچا تانی میں حالات بگڑے ہیں ان کی آوازیں پاکستان کی سلامتی کے حق میں ہوتے ہوئے بھی دبا دی جاتیں۔ ایسے بے شمار حقیقی کردار

تھے جو مسعود مفتی کی نگاہوں سے گزرے جو ملکی سلامتی کیلئے ہر قربانی دینے کیلئے تیار تھے مگر افسوس کہ چند کالی بھیڑیں ان کی وفاداریوں کے قابل نہیں تھیں۔ مسعود مفتی نے اس سانحے کا ایک اور حقیقی کردار بھی پیش کیا۔ جو یہ بات واضح کرتا ہے کہ خانہ جنگی اور ہنگاموں کے باوجود مشرقی پاکستان کی اکثریت علیحدگی نہیں چاہتی تھی۔ اسی نقطہ نظر کی وضاحت مسعود مفتی اس انداز میں کرتے ہیں:

> زائرہ سلطانہ ایک علامتی المیہ تھی۔ اس قومی بے حسی کا جو مغربی پاکستان نے وفادار بنگالیوں کے ساتھ روا رکھی۔ ہم نے ہر وقت اس بنگالی کے متعلق سوچا جو ہم سے علیحدہ ہونے کیلئے ہنگامے کر رہا تھا، مگر اس بنگالی کو مسلسل نظر انداز کرتے رہے جو ہمارے ساتھ رہنے کیلئے تڑپ رہا تھا۔[16]

مشرقی پاکستانیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں پر صدیق سالک نے بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ مغربی پاکستان سے جب انہیں مشرقی حصے میں تعینات کیا گیا تو اس سرزمین پر پہنچتے ہی ایک ایسا خود احتسابی کا عمل شروع ہو گیا جو ملک ٹوٹنے کے بعد بھی ختم نہ ہوا۔ صدیق سالک نے واضح طور پر یہ محسوس کیا تھا کہ دونوں خطوں کے عوام کے طرزِ زندگی میں بہت فرق ہے۔ ان کی معاشی حالت اس بات کی غماز تھی کہ لوگ غربت سے بھی نچلی سطح کی زندگی گزار رہے تھے۔ یوں ملکی سیاست کے بگڑتے حالات اس دوری کو مزید دوام بخش رہے تھے۔ عوام تن اور روح کا رشتہ استوار رکھنے کے لیے دن رات کوشاں تھے، مگر اس کے باوجود انہوں نے جو کچھ دیکھا وہ وہاں کی اکثریت کی حالت زار بیان کرنے کو کافی تھا۔ نحیف و لاغر جسم کے مرد اور بچے بہ مشکل ستر پوشی کیلئے پہنے چیتھڑوں میں گھوم رہے تھے، جو عورتیں اُن کی نگاہوں سے گزریں وہ اُن کو یہ سمجھانے کیلئے کافی تھیں کہ اگر حالات خراب ہوئے تو یہ لوگ کسی بھی حد تک جاسکتے ہیں۔ جن کو دو وقت کی روٹی، کپڑا اور مکان میسر نہ تھا وہ اپنی بقا کیلئے کوئی بھی خون خرابہ کرنے کو تیار ہو سکتے تھے۔ اپنی آنکھوں سے اس معاشی بدحالی کی صورتحال دیکھنے کے بعد ان کی رائے تھی:

> اگر یہ بھوکے ننگے لوگ انبوہ در انبوہ مشتعل ہو جائیں تو واقعی بازار لوٹ سکتے ہیں، چھاؤنی پر ہلہ بول سکتے ہیں اور میرے گھر میں بم بھی پھینک سکتے ہیں۔[17]

صدیق سالک کے اس حوالے سے پیش کیے گئے نظریات ہمیں ایک ایسی کھلی کچہری میں لا کھڑا کرتے ہیں جہاں احتساب لازم ہو جاتا ہے۔ وہ نفرت اور رعونت جو ایک ہی ملک کے دو حصوں کے لوگوں میں نظر آنے لگی تھی وہ کبھی بھی بے جا نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے محرکات میں یقیناً بہت سے رویوں کا ردعمل بھی شامل تھا۔ ایک ہی ملک کے وہ باسی جنہوں نے بے پناہ قربانیوں کے بعد وطن کو حاصل کیا تھا چند سالوں بعد کیوں اس نہج تک آئے تھے جہاں

نوبت خانہ جنگی تک آن پہنچی تھی اور آخری ضرب لگنے میں بھی دیر نہ لگی۔ انہی رویوں کے پس منظر میں جھانکتے صدیق سالک لکھتے ہیں کہ:

> اُن دو مشکل برسوں پر نظر ڈالتا ہوں تو نفرت، بُعد اور علیحدگی کا ذمہ دار اپنے آپ کو اور اپنے مغربی پاکستانی ساتھیوں کو زیادہ گردانتا ہوں۔ کیونکہ اگر آپ بطور چیف سیکریٹری اُن کو اپنے دفتر کے قریب بھٹکنے نہیں دیں گے، بطور ڈپٹی کمشنر انہیں پہروں برآمدے میں بٹھائے رکھیں گے یا بطور آرمی آفیسر ریل گاڑی سے اُن کو اُتار کر زبردستی اپنے مہمان سوار کروادیں گے تو وہ یقیناً یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں آزادی نہیں پائی، صرف آقا بدلے ہیں۔[۱۸]

امتیازی سلوک کی یہ مثال ظاہر کرتی ہے کہ نفرت کا آغاز صرف اعلیٰ حکام کی طرف سے ہی نہیں ہوا تھا بلکہ ہر محکمے میں ایسے لوگ موجود تھے جو نفرت، تعصب اور تنازعات کو ہوا دے رہے تھے۔ صدیق سالک کا یہ نظریہ بے بنیاد نہیں تھا۔ اُس کے پیچھے وہ مشاہدات و واقعات کھڑے تھے جن کا سامنا انہیں مشرقی پاکستان جا کر ہوا تھا۔ اسی طرح کی صورتحال کی مثال کمال متین الدین نے بھی اپنی کتاب میں پیش کی۔ لکھتے ہیں:

> مسٹر عزیز احمد جو پچاس کی دہائی کی ابتداء میں مشرقی بنگال میں چیف سیکٹری تھے، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ کھلی کچہریاں لگایا کرتے تھے جبکہ خود ایک مچھر دانی میں بیٹھے رہتے تھے تاکہ ہر وقت موجود رہنے والے مچھروں کے جم غفیر سے بچ سکیں۔ مشرقی بنگال میں کام کرتے ہوئے مغربی پاکستان کے بیوروکریٹس کی طرف سے ایسا رویہ خاص طور پر پنجابی اہلکاروں کے خلاف عداوت کے احساس کا موجب بنا۔[۱۹]

مشرقی پاکستان کا مغربی خطے سے جدا ہو جانا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ اس میں جہاں بنگالیوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیاں معانی رکھتی ہیں وہیں دیگر ایسے بہت سے عوامل تھے جو پس پردہ بہت بڑے عزائم کو لے کر چل رہے تھے۔ ان میں ایک بہت بنیادی اور بڑی وجہ ہمارا بوگس تعلیمی نظام تھا۔ حکمران قطعی لاعلمی کے عالم میں نظریں پھیرے ہوئے اپنی سیاسی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ وہ یہ نہیں دیکھ رہے تھے کہ مشرقی پاکستان کی اکثریت وہ لٹریچر پڑھ رہی ہے جو کلکتہ سے چھپ کر آتا ہے اور تقسیم کے بعد سے وہاں قریباً ۹۰ فیصد ہندو اساتذہ پڑھا رہے تھے۔ استاد جو بچے کی ذہنی تربیت کا ذمہ لیتا ہے اگر علیحدگی پسندی کا بیج بوئے تو فصل ملک کے ٹوٹنے کی صورت میں کاٹی جاتی ہے۔ مارچ ۱۹۷۱ء میں مسعود مفتی کو جب پاکستان بھیجا گیا تو ان کی حیثیت سیکٹری امور تعلیم کی تھی۔ بحیثیت بیوروکریٹ اور محب وطن پاکستانی وہ اس جذبے کے ساتھ وہاں گئے کہ تعلیمی نظام میں بہتری لائیں گے۔ ان حالات

سے لڑیں گے جو ملک دشمن عناصر کو تقویت دیتے ہیں۔ مگر مشرقی پاکستان پہنچ کر انہیں اندازہ ہوا کہ جس انفرادی جذبے کو لے کر وہ یہاں پہنچے ہیں اگر وہ آج سے ۲۴ سال قبل اجتماعی صورت میں آن موجود ہوتا تو ملک اس سانحے سے دوچار نہ ہوتا۔ علیحدگی پسندی کا جو بیج ملک دشمن عناصر نے پاکستان بنتے ہی ہماری نسلوں میں بویا تھا وہ اب ایک تن آور درخت بن چکا تھا۔

سیکٹری تعلیم کی حیثیت سے مسعود مفتی نے تعلیمی نظام کی خرابیاں بہت واضح انداز میں بیان کی ہیں۔ اس حوالے سے اُن کا بے لاگ تبصرہ اور رائے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ۱۹۷۱ء اور اس سے قبل کی تعلیمی پالیسیوں اور ان کے نتائج کو مد نظر رکھتے ہوئے مسعود مفتی نے اپنی رائے قائم کی تھی۔ ان کے نظریات نے جن مشاہدات و تجربات کی زمین کو دیکھا وہ ایک مسلم ریاست تھی۔ مگر وہاں کا نظامِ تعلیم ہندوؤں کے اثر و رسوخ سے چل رہا تھا۔ تعلیمی نظام کی خرابیاں آن کی آن میں درست نہیں کی جاسکتی تھیں نہ ہی اُن سے پیدا ہوئے بگاڑ کو تھوڑے سے عرصے میں ختم کیا جاسکتا تھا۔ اپنے نظریات کو مسعود مفتی نے کچھ اس انداز میں بیان کیا:

> مشرقی پاکستان میں ملک دشمن عناصر کو جو فروغ ملا وہ زیادہ تر ہمارے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں ہی کی وجہ سے ہے جہاں بنگالی قومیت پر غیر ضروری زور دے کر پاکستان دشمنی اور ہندوستان دوستی کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جہاں حقائق کو موڑ توڑ کر مغربی پاکستان کے خلاف نفرت کا سمندر پھیلا دیا گیا کیونکہ مغربی پاکستان نے خود کبھی حقائق کو صحیح انداز میں پیش کرنے کی زحمت نہیں کی۔[۲۰]

تعلیم کا نظام درست سمت میں نہ ہونے کا جو نقصان ہماری قوم نے اٹھایا اس کا ازالہ کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں سازشوں کا جال بچھا کر بالکل غیر محسوس انداز میں قومیت کا زہر اُنڈیلا جارہا تھا اور ہم اس سے بے خبر کرسی کی کھینچا تانی میں مصروف رہے۔ مسعود مفتی چوں کہ بالخصوص اس عہدے پر معمور تھے، اس لیے اس سلسلے میں ان کے مشاہدات ہی ان کے نظریات کی بنیاد بنے۔ انہیں اندازہ تھا کہ ہندو اساتذہ نے ہمارے ملک کی سلامتی کو کس دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اس ہوا کے رخ کے تعین میں سب سے بڑا حصہ ہندو اساتذہ کا تھا۔ اس کے بعد ان عناصر کا جو یا تو ہندوستان کے ایجنٹ تھے یا اپنے طور پر نظریہ پاکستان مین یقین نہیں رکھتے تھے۔ یہ عناصر بڑے مؤثر طریقے سے پالیسی مرتب کرنے والے اداروں میں دخیل تھے۔[۲۱]

مسعود مفتی کا یہ اظہار خیال اس بات کی دلیل تھا کہ ہندو اساتذہ نے واقعتاً ایک ایسی نسل پروان چڑھادی تھی جس کے لاشعور میں احساس محرومی اور مغربی پاکستان سے نفرت کا لاوا مسلسل پک رہا تھا۔ جنہیں غیر محسوس انداز میں یہی بتایا

جاتا رہا تھا کہ وہ کسی سے کمتر نہیں ہیں اور ان کا بھی مغربی پاکستانیوں کی طرح وسائل پر مکمل حق ہے۔ ان خیالات سے پروان چڑھنے والی نسل کا ایک نمائندہ مسعود مفتی کی رپوتاژ کا حقیقی کردار تھا۔ عطاء الحق نامی نوجوان افسر کی نفسیات اور اس کے خیالات کا بیان مسعود مفتی کو یہ سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ ہم بنگالیوں سے کس حد تک دور جا چکے ہیں۔ مسعود مفتی کی عطاء الحق سے کی گئی گفتگو ان پر رفتہ رفتہ وہ تمام گرہیں کھول رہی تھی جو مشرقی پاکستان آنے سے قبل ان کے ذہن پر لگی تھیں۔ حقیقت بہت بھیانک انداز میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔ اس تعلیمی نظام کا حقیقی چہرہ اور کردار ان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> وہ اس نسل کا بھرپور نمائندہ تھا جو پچھلے چوبیس برس کے نظام تعلیم کی پروردہ تھی۔ میں اس نسل کے دل و دماغ میں جھانکنا چاہتا تھا جس کے لاشعور نے اس کے شعور کو گمراہ کر دیا تھا۔ لاشعور ہندو پروپیگنڈے سے متاثر تھا۔ مگر شعور اس کیفیت سے لاعلم تھا۔[۲۲]

عطاء الحق اور اس جیسے بے شمار کردار ہر طرف موجود تھے جو ہمارے اس تعلیمی نظام کی پیداوار تھے جس کی سربراہی ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ ہماری اس غفلت کا نتیجہ تھا جو پاکستان بننے کے بعد سے ہم نے برتی تھی۔ ان لاپروائیوں کا خمیازہ پوری قوم نے بھگتا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں پیش آئی ناکامی کا بدلہ ہندوؤں نے ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی صورت میں لیا تھا۔ ہماری نسل کو گمراہ کرنے والے بہت دور اندیش لوگ تھے جبھی ان کی سازشوں کا فائدہ انہیں ملک کو توڑنے کی صورت میں ملا۔ مسعود مفتی نظام تعلیم کی اہمیت سے بہت اچھی طرح واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ کسی قوم کا تعلیمی معیار جب پست ہو جائے یا منفی سرگرمیوں میں گھر جائے تو اس کا ازالہ پوری قوم کو چکانا پڑتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> نظام تعلیم ایک خاص رخ میں چلنے والی ہوا ہے۔ جس کے رخ کا تعین ہر قوم کو خود کرنا پڑتا ہے۔ بد قسمتی سے ہمارے تساہل کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں یہ ہوا چوبیس برس تک پاکستان کے مخالف رخ میں چلتی رہی اور نئی نسل کے ننھے پودوں کے گرد آہستہ آہستہ دیو قامت پہاڑ بن گئے۔ جن کی ڈھلانیں ایسی تھیں جیسے کوئی پاکستان سے روٹھ کر اپنی پیٹھ موڑ لے۔[۲۳]

مسعود مفتی کے مشرقی پاکستان کے تعلیمی نظام کے متعلق نظریات ان حقائق کی بنیاد پر تھے جو بالکل درست تھے۔ اس بات کی تصدیق بہت سے محققین اور ادیبوں نے کی۔ ہر کوئی اپنی تحقیق کے مطابق تعلیمی نظام کو زیر بحث لایا۔ عنایت اللہ اپنی کتاب ہماری شکست کی کہانی میں لکھتے ہیں:

ہندو تعلیمی اداروں میں بنگالی نوجوانوں کو بنگالی قومیت اور ہندوازم کے سبق دیتا رہا۔ ہمارے مذہبی سربراہ اس کا مقابلہ نہ کر سکے۔ [۲۴]

مسعود مفتی کی نسبت صدیق سالک نے تعلیمی نظام پر اس طرح سے تفصیلاً بحث نہیں کی البتہ ان کی تحریروں میں اس لٹریچر کے متعلق گفتگو موجود ہے جو دوران قید ان تک پہنچتا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ سے قبل کے سالوں میں اسی طرح کا مواد بنگالی بچوں کے ذہنوں میں بھی بٹھایا جاتا رہا تھا جس کا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ صدیق سالک کی نظر سے گزرنے والا وہ لٹریچر جو بھارتی رسائل کے ذریعے آتا تھا کچھ اس طرح کا رخ پیش کرتا کہ جس سے بھارت کی کشادہ دلی ظاہر ہوتی۔ کسی ہندو کی لکھی گئی نعت رسولؐ رسالے میں شامل کر دی جاتی تاکہ مسلمانوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ ہم بھی رسولؐ کی سیرت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ غرض ہندو قوم نے کوئی حربہ نہ چھوڑا۔ مگر اتنے عرصے میں صدیق سالک یہ بات جان چکے تھے کہ وہ اب لٹریچر کے ذریعے نفسیاتی وار کرنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں اپنے نظریات اس طرح سے پیش کرتے ہیں:

> اردو کے اخبار اتپر تا باور ملاپ ہوں یا انگریزی کے انڈین ایکسپریس، ہندوستان ٹائمز اور ٹائمز آف انڈیا سب ایک ہی نظریے کا پرچار کرتے۔ صرف لبادہ، وضع قطع اور رنگ مختلف ہوتا۔ ان سب کی جان بھارتی حکومت کے ہاتھ میں تھی اور یہ سب اپنے آقا کی آواز His Master's Voice بلند سے بلند تر سُر تال میں قارئین تک پہنچاتے۔ [۲۵]

صدیق سالک چند فلموں کا ذکر بھی مختصراً کرتے ہیں جن سے یہ بتانا مقصود تھا کہ بھارتی عزائم ملک توڑنے سے قبل جتنی سرعت سے کام کر رہے تھے ملک توڑنے کے بعد بھی اسی محنت سے اپنے کام میں مصروف عمل تھے۔ ان کی دکھائی گئیں فلمیں اسی بنیادی مقصد کو لے کر چلیں کہ مذہب کوئی معنی نہیں رکھتا مسلمان ہندو سب ایک ہیں۔ جس شر کا بیج ہندو نے بویا تھا صدیق سالک اس کی فصل کی کٹائی میں شامل رہے تھے لہٰذا ان کے لیے اس بھارتی پروپیگنڈے کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ یہ سلسلہ پاکستان ٹوٹنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوا اور بھارتی لٹریچر مسلسل خود کو ہیرو ظاہر کرتا رہا۔ یہاں تک کہ خود مشرقی پاکستان موجودہ بنگلہ دیش میں پاکستانیوں کا کردار نہایت مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ جو اس بات کی دلیل تھا کہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے جس قومیت پرستی کا پرچار کیا جاتا رہا تھا۔ اس کا اثر سالوں بعد بھی ویسے ہی قائم تھا۔ سر میلا بوس اس حوالے سے لکھتی ہیں کہ:

بنگالی ڈراموں میں پاکستانیوں کو ولن اور بنگالیوں کو مظلومیت کی تصویر دکھایا جاتا رہا اور اس ڈرامائی تشکیل میں حقائق کو بڑی حد تک مسخ کر کے پیش کیا گیا۔ تمام اطراف سے آنے والا مواد حیرت انگیز حد تک ایک دوسرے سے مختلف ہے۔[۲۶]

شکست کی ان تمام وجوہات کے ساتھ ہماری تاریخ کی چند ایسی شخصیات بھی اس سلسلے میں قابلِ ذکر تھیں جنھوں نے ملک کا جغرافیہ ہی بدل کر رکھ دیا۔ صدر آغا محمد یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو، مجیب الرحمٰن اور ایسٹرن کمانڈر امیر عبداللہ خان نیازی ان میں سرِ فہرست ہیں۔ اس فہرست میں دیگر آلہ کار بھی شامل تھے مگر اربابِ اختیار کی حیثیت انہی شخصیات کو حاصل تھی۔ اس سے قبل کے فوجی آمر اور سیاستدان بھی اس قدر قابلِ ستائش نہ تھے مگر سقوطِ ڈھاکہ کے وقت ان لوگوں کا اقتدار میں ہونا ان کی اہمیت میں اضافہ کرتا ہے۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک دونوں شخصیات نے اپنے تجربات کی بنیاد پر اس حوالے سے رائے قائم کی ہے۔ شخصیات کے حوالے سے صدیق سالک کے تجربات مسعود مفتی کی نسبت زیادہ ملتے ہیں۔ اپنے پیشے کی نوعیت اور مشاہدات کے مطابق مسعود مفتی نے حتی الامکان حقائق پر مبنی رائے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ مجیب الرحمٰن کے علیحدگی پسند نظریات کی توضیح بہت واضح انداز میں شواہد کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> جن لوگوں کا خیال ہے کہ مجیب علیحدگی پسند نہیں تھا اور بنگال بھی آزاد نہیں ہونا چاہتا تھا وہ صرف ۲۲ مارچ کے شمارے کے پہلے صفحے پر ایک نظر ڈال لیں تو انہیں کوئی شک نہیں رہے گا۔ من جملہ دیگر چیزوں کے ایک خاص چیز بنگلہ دیش کا جھنڈا ہے جس کی تصویر دو کالم پر پھیلی ہے۔ اس کے نیچے درج ہے۔[۲۷]
>
> A new flag is born today___This is the flag for independent BanglaDesh.This is the flag that symbolizes the emancipation of 75 million Bangales.

یہ وہ رائے تھی جو حقائق کے ساتھ پیش کی گئی تھی۔ مسعود مفتی کے مطابق ان حالات میں فوجی ایکشن بالکل درست عمل تھا۔ بگڑتے حالات کو قابو کرنے کی اور کوئی صورت نہیں بچی تھی۔ حالات کو اس نہج تک پہنچانے میں اکیلے مجیب الرحمٰن کا ہی عمل دخل نہیں تھا بلکہ مغربی پاکستان کے سیاستدانوں کا بھی مکمل حصہ شاملِ حال رہا۔ حالات کی کڑیاں جوڑنے کے بعد مسعود مفتی کرداروں کے وہ روپ پیش کرتے ہیں جو پوری دنیا نے دیکھے۔ اس ضمن

میں یحییٰ خان کا کردار دیکھیں تو ان کے اقتدار کی ہوس کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مسعود مفتی کہتے ہیں:

> جنرل یحییٰ کی توجہ اندرونی اور بیرونی دشمن کی طرف نہ تھی بلکہ صرف اپنے اقتدار کو مستقل کرنے کی طرف تھی۔ وہ ملک بچانے کی بجائے تخت بچانے میں مصروف تھے۔ قوم کی امانت میں حکمرانوں کی خیانت— قائد اعظم کی وفات کے بعد سے یہ ہماری قومی بیماری تھی جو گھن کی طرح ملک کو اندر ہی اندر کھا رہی تھی۔ [۲۸]

مسعود مفتی اپنے مضمون *Verdict of History* جس کا ترجمہ خود انہوں نے تواریخ کا فیصلہ کے عنوان سے کیا ہے، میں نتائج کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک حتمی رائے بھی قائم کرتے ہیں۔ صدر آغا محمد یحییٰ خان، پی پی پی کے بانی ذوالفقار علی بھٹو اور عوامی لیگ کے سربراہ شیخ مجیب الرحمٰن ان تینوں شخصیات نے مل کر ملک کو جس شرمناک حادثے سے دوچار کیا اس کا مسعود مفتی کو مکمل ادراک تھا۔ تمام تاریخی شواہد اور ٹوٹے ہوئے پاکستان کی حالتِ زار دیکھنے کے بعد ان کی رائے تھی کہ:

> ان تینوں کا سیاسی طرزِ عمل شرمناک حد تک خود غرضانہ تھا اور اپنی ذات پر مرکوز تھا۔۔۔ یحییٰ اور بھٹو کا الحاق صرف اسی وجہ سے ممکن ہو سکا کہ دونوں کی ہوس اقتدار بڑی سنگ دلی سے ہر غیر آئینی قبضے پر آمادہ اور تیار تھی۔ چنانچہ اقتدار کے دونوں بھوکوں نے مصنوعی جنگ میں بغیر کسی مؤثر مقابلے کے مشرقی پاکستان کا ترنوالہ ہندوستان کو ہڑپ کرنے دیا۔ انجام کار تینوں کو اپنا اپنا انعام مل گیا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کو بنگلہ دیش کی حکومت ملی۔ بھٹو باقی ماندہ پاکستان پر قابض ہو گئے اور یحییٰ خان قوم کے غیض و غضب سے صاف بچ گئے، کیوں کہ بھٹو نے حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ دفن کر دی تاکہ یحییٰ خان پر کھلا مقدمہ نہ چل سکے۔ [۲۹]

صدیق سالک جو سقوطِ مشرقی پاکستان کے وقت کیپٹن کے عہدے پر فائز تھے ایسے بہت سے واقعات کے شاہد تھے جن کا تعلق جنگی و سیاسی صورتحال سے تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے مرکزی کرداروں کے متعلق اپنا بے لاگ تبصرہ پیش کرتے ہیں۔ سیاسی و عسکری شخصیات سے جس حد تک ان کی وابستگی تھی اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بھی اپنی رائے شامل کی ہے۔ بغور جائزہ لیں تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی تاریخ میں سیاستدانوں اور جرنیلوں نے مل کر جتنا فساد بپا کیا وہ ہماری تنزلی کے لئے کافی تھا۔ صدیق سالک کی رائے میں ہر اچھا جرنیل ایک اچھا سیاستدان ثابت نہیں ہو سکتا کیوں کہ ان دونوں عہدوں کی اپنی اپنی ذمہ داریاں اور ترجیحات ہیں۔ ملکی تاریخ یہ بھی ثابت کرتی ہے کہ

جرنیلوں نے جہاں سیاستدان کی حیثیت سے مداخلت کی اس کا نتیجہ درست نہیں نکلا۔ جنرل یحییٰ خان ملکی حالات کو سنبھالا دینے کی بجائے جس انداز میں بگاڑتے گئے اس کے بعد کی صورتحال خود ان کے اپنے قابو سے باہر تھی۔ صدیق سالک کہتے ہیں:

> در حقیقت ماہِ مارچ کے پہلے پندرھواڑے میں حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا اور یحییٰ خان نے انہیں جس طرح خراب سے خراب تر ہونے کا موقع دیا تھا، اس کے بعد گفت و شنید اور صلاح و مشورے کے امکانات خاصے کم ہو چکے تھے۔ اب جناب مجیب یہ سمجھنے لگے تھے کہ پورے صوبے پر میرا قبضہ ہے۔ میں یہ اقتدار یحییٰ خان کو کیوں لوٹاؤں اور یحییٰ خان سوچتے تھے کہ میں پورے ملک کا سربراہ اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہوں میں رضاکارانہ طور پر مجیب کی حاکمیت کیسے تسلیم کروں۔[۳۰]

یہ وہ نفسیاتی کشمکش تھی جس کا صدرِ پاکستان کو سامنا تھا۔ یہاں صدیق سالک ان کی جس حالتِ زار کو بیان کرتے ہیں وہ خود ان کی اپنی پیدا کردہ تھی۔ مجیب الرحمٰن کا کردار بھی ان کے مشاہدات و تجربات سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ مجیب الرحمٰن کی دوغلی شخصیت سے واقف تھے۔ ہر سیاسی و عسکری معاملے میں شیخ مجیب جو پینترے بدلا کرتے تھے وہ صدیق سالک جیسے بالغ نظر انسان کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں تھے۔ ان کی وہ عادت جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھی کے متعلق بات کرتے ہوئے صدیق سالک لکھتے ہیں کہ:

> یہ مجیب کی پہلی قلابازی تھی نہ آخری۔ یہ دراصل ان کے کردار کا لازمی جزو تھا۔ مجھے کئی ایسے واقعات یاد ہیں جب وہ سرِعام شیر کی طرح گرجتے مگر اندر خانے حکام کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے۔[۳۱]

تاریخ کے ان بھیانک کرداروں نے جہاں تک ممکن ہوا اپنے ناپاک عزائم سے ملک کو داغدار کیا۔ یہاں ان کی دیدہ دلیری بھی قابلِ غور ہے کہ اس عظیم سانحے کے بعد اس کا ذمہ ایک دوسرے پر مسلط کرتے رہے۔ ہر ایک نے اپنا جرم اپنے کندھوں سے اتار کر دوسرے کو زیرِ بار کرنے کی کوشش کی۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے بنگلہ دیش کا صدر بننے کے بعد بی بی سی کے شہرت یافتہ ڈیوڈ فراسٹ کو انٹرویو دیا۔ ایک سوال کے جواب میں شیخ مجیب نے یحییٰ خان کے متعلق اس طرح سے رائے کا اظہار کیا:

> وہ یقیناً خود سے شیطان تھا اور اس کے دوست بھی شیطان تھے۔ یحییٰ خان ان سب کاموں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر بری الذمہ نہیں ہو سکتا وہ مکمل طور پر ایک مکروہ انسان تھا۔[۳۲]

اس سانحے کا ایک اور مرکزی کردار جنرل نیازی تھے جو عسکری ناکامی کے حوالے سے سامنے آتے ہیں۔ ان کے ذاتی فعل پر تنقید کے ساتھ ساتھ ان کے ملکی سطح پر کئے گئے فیصلے بھی سوالیہ نشان بنے ہوئے ہیں۔ صدیق

سالک ان کے کردار کے وہ پہلو سامنے لاتے ہیں جو ہمیں یہ سمجھنے میں مدد دیتے ہیں کہ پہاڑ جتنی باتیں کرنے کے بعد رائی جتنا دل رکھنے والے کیسے ہوتے ہیں۔ وہ اعلیٰ عسکری و اخلاقی کرداری خوبیاں جو کسی بھی جرنل کا خاصہ ہو سکتی ہیں جنرل نیازی میں مفقود تھیں۔ صدیق سالک نے ان کا جو رخ بہت قریب سے دیکھا اس کے بعد اپنا نظریہ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

> وہ باہر شیر اور اندر گیدڑ تھے۔ ایک طرف وہ ایئرپورٹ پر غیر ملکی صحافیوں کے سامنے سینہ تان کر کہ رہے تھے کہ دشمن کو ڈھاکہ میں داخل ہونے کے لئے میری چھاتی پر سے ٹینک گزارنے ہوں گے اور دوسری طرف گورنر ہاؤس میں ویٹروں کے سامنے سسکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔ [۳۳]

وہ جو یہ سمجھتے تھے کہ جنگ ہونے پر بھارت کو میدانِ کارزار بنا ڈالیں گے نہ جانے کیسے بھارتی افواج کے سامنے ہتھیار ڈال گئے۔ سبھی مرکزی کردار ملک اور عوام کو دھوکہ دینے میں پیش پیش تھے بلکہ ہر کوئی سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ صدیق سالک اور مسعود مفتی کی آراء میں یہ سب کردار کسی نہ کسی طور ملک توڑنے میں اپنا حصہ ڈالتے آئے ہیں۔ جنرل نیازی کے متعلق صدیق سالک نے اپنی کتاب میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا میں جو آراء پیش کیں ان کا جواب جنرل نیازی نے اپنی کتاب میں نے ہتھیار کیوں ڈالے میں وقتاً فوقتاً دیا۔ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> صدیق سالک تو جنگ اور جنگی حکمتِ عملی کی الف ب سے بھی واقف نہیں۔ اس سطح کے منصوبوں پر تبصرہ کرنا اس برخودار کے بس کی بات نہیں تھی۔ معلوم ہوتا ہے صدیق سالک نے میرے منصوبوں میں خامیاں تلاش کرنے کا کسی سے سبق پڑھا ہو گا۔ ان کے استاد تو وہی تھے جنہیں نہ لڑائی کا تجربہ تھا نہ افواج کی کمان کا۔ [۳۴]

اگر جنرل نیازی کی اپنے حق میں صفائی کی کوشش کو درست بھی مان لیا جائے تو حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کی صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جہاں حقائق تاریخ کا دامن کھولے کھڑے ملتے ہیں۔ جنرل نیازی کے حوالے سے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں درج ہے:

> جنرل نیازی کی فوجی ناکامیوں سے بھی زیادہ تکلیف دہ داستان، اس حقارت آمیز انداز کی ہے، جس میں انہوں نے ہتھیار ڈالنے کی دستاویز پر دستخط کئے۔۔۔ ڈھاکہ ایئرپورٹ پر فاتح بھارتی افواج کے جنرل اروڑہ کا استقبال اور اسے "گارڈ آف آنر" کی پیش کش، اور اس کے بعد ریس کورس میں منعقد ہونے والی ہتھیار ڈالنے کی عوامی تقریب میں ان کی شرکت ایسے واقعات ہیں جنہوں نے پاکستان اور اس کی مسلح افواج کے سر ہمیشہ کے لئے شرم سے جھکا دیئے ہیں۔ ان واقعات کے عینی شاہدین نے اس کمیشن

کے روبرو تفصیلی بیانات دیئے ہیں۔ ان کی روشنی میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہ جاتا، کہ جنرل نیازی جنگ کے اختتامی مرحلوں میں، مکمل "اخلاقی دیوالیہ پن" کا شکار ہو چکے تھے۔ [۳۵]

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ جس کو ایک عرصے تک صیغہ راز میں رکھا گیا ان تمام حقائق کو سامنے لاتی ہے جو سقوطِ ڈھاکہ کے الم ناک سانحے سے منسلک ہیں۔ اس رپورٹ میں نہ صرف جنرل نیازی بلکہ تمام معتوب کرداروں جن میں صدر یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو، شیخ مجیب الرحمٰن اور دیگر بہت سے ذیلی کردار شامل ہیں کو احتساب کے کٹہرے میں لایا گیا ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں ہے۔ حمود الرحمٰن کمیشن کی تفصیلی رپورٹ کے مطابق نتائج کچھ یوں تھے:

> اس معاملے کے تمام شواہد اور پہلوؤں کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ہم اس حتمی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ جنرل یحییٰ خان اور ان کے قریبی ساتھیوں کی یہ نیت ہرگز نہ تھی کہ مارچ کہ دوران کئے گئے سیاسی مذاکرات کو کسی بھی طور پر نتیجہ خیز بنایا جائے! وہ فوجی اور سیاسی صورتحال کا مکمل ادراک اور شعور رکھتے تھے اس کے باوجود انہوں نے پختہ عزم کر رکھا تھا کہ کسی بھی مرحلے پہ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل نہ کیا جائے۔ [۳۶]

اس سلسلے میں ہمیں مجیب الرحمٰن اور بھٹو کے کردار سے متعلق بھی تسلی بخش تاریخی شواہد ملتے ہیں۔ تاریخی حقائق کو مدِ نظر رکھیں تو اس سانحے میں ان کا کردار بھی ناقابلِ فراموش ہے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ نے جہاں سب کو احتسابی عمل کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا وہیں ان شخصیات کی سنگین غلطیاں بھی تاریخ میں رقم کر دی گئیں۔ رپورٹ کے مطابق:

> حقائق خواہ کچھ بھی رہے ہوں ہمیں لگتا ہے کہ تصادم کے راستے کا انتخاب کر کے شیخ مجیب الرحمٰن نے ایسی سیاسی عدم فراست کا مظاہرہ کیا جس کے نتیجے میں یہ ملک بالآخر دو ٹکڑے ہو گیا۔۔۔ ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین نے بھی سیاسی دور اندیشی کے فقدان کا مظاہرہ کیا اور قومی اسمبلی کے اجلاس کو ملتوی کئے جانے کے نتیجے میں مشرقی پاکستان میں رونما ہونے والے متوقع ردِ عمل کی شدت کا اندازہ لگانے میں بری طرح ناکام رہے۔ [۳۷]

یہ ان شخصیات کی سیاسی ہوس کا مختصر احوال تھا جو مسعود مفتی اور صدیق سالک کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ ان کی آرا کی تصدیق حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ سے بخوبی کی جا سکتی ہے۔ مگر کرداروں کی اداکاری یہاں ختم نہیں ہوئی تھی۔ ان سب کے پیدا کردہ حالات ہمیں اس دوراہے سے گزارنے جا رہے تھے جس کی منزل صرف

شکست تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ اس کے بعد ہونے والی خانہ جنگی آدھا ملک لے ڈوبی۔ بنگلہ دیش کا قیام ملک کو جس دکھ میں مبتلا کر کے گیا اس کا ازالہ آج تک نہ ہو سکا۔ خانہ جنگی کی وہ صورتحال جہاں اپنے ہی ہم وطنوں کے لئے ہتھیار اٹھانے پڑیں ایک دوہری شکست وریخت سے دوچار کرتی ہے۔ خانہ جنگی سے بپا ہونے والے فسادات نے وہ تاریخ رقم کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ اپنے ہی ملک کے باسیوں نے مکتی باہنی کے ساتھ مل کر لوگوں کا قتلِ عام جس انداز میں کیا وہ آج بھی قاری کو لرزا دیتا ہے۔ یہ وہ واقعات تھے جن کے نتائج مسعود مفتی اور صدیق سالک نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ ادیب کی آنکھ نے وہ لمحات جس سچائی سے محفوظ کئے وہ آج بھی سننے اور پڑھنے والوں پر سناٹا طاری کر دیتے ہیں۔ جنگیں تو ہمیشہ سے انسانوں کی تباہی میں اہم کردار ادا کرتی آئی ہیں لیکن ۱۹۷۱ء کی جنگ شرمندگی کا وہ کلنک ہے جو ہماری جبینوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سیاہی کے نشان چھوڑ گیا ہے۔

ظلم و بربریت کے وہ مناظر جو مسعود مفتی نے دیکھے ان کو قلم کے ذریعے الفاظ میں ڈھالا۔ یہ وہ الفاظ ہیں جو آج بھی کسی حد تک وہ مناظر پیش کرنے میں معاون ہیں جن کی گواہی خود ادیب کی آنکھیں دیتی ہیں۔ بنگالی ایک ایسی قوم کی صورت میں اُبھرے تھے جنہوں نے غیر بنگالیوں، بہاریوں اور مغربی پاکستانیوں کو ہر طرح سے موت کے گھاٹ اتارا۔ ظلم و بربریت کی جو فضا مسعود مفتی نے دیکھی اس کی گواہی آج بھی بہت سے لوگ دیتے ہیں۔ مکتی باہنی کے مظالم کا شکار ہونے والوں کو مختلف انداز میں صفحہ ہستی سے مٹایا گیا۔ مسعود مفتی کو جن عینی شاہدین نے اپنے غم کی داستان سنائی اس میں ذبح کیا جانا، عصمت دری کے واقعات، گولیوں سے بھون دیا جانا، ڈرپ کے ذریعے جسم سے خون کھینچ لینا اور ایسے بہت سے بے دردی کے مظاہرے شامل تھے۔ انسانیت کو شرما دینے والے ان واقعات نے ہمیں بحیثیت قوم بہت حد تک گرا دیا۔ یہ وہی قوم تھی جس نے ۱۹۴۷ء میں پاکستان حاصل کرنے کے لئے گردشِ دوراں کے ہچکولے متحدہ صورت میں کھائے تھے۔ جن کا ہر غم مشترک تھا۔ جن کی امیدیں اور حسرتیں پاکستان سے وابستہ تھیں اور یہ سب موت کے سائے تلے اکھٹے بیٹھے تھے۔ مگر اس صورتحال میں اپنے ہی ہم وطنوں کا گلا کاٹ رہے تھے۔ عبدالرؤف ایک عینی شاہد ہیں جنہوں نے ۱۹۴۷ء میں صوبہ بہار سے اور ۱۹۷۱ء میں چٹاگانگ سے ہجرت کی تھی۔ عبدالرؤف صاحب نے ہمیں انٹرویو ریکارڈ کراتے ہوئے بتایا کہ:

> ہمارا بھائی کو ہمارے سامنے قتل کیا۔ دروازہ کھٹکھٹایا چھرا مار دیا۔ انتڑیاں باہر نکل آئیں۔ اس کا بیوی کپڑا باندھ کر ہسپتال لے گئی۔ انہوں نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ لوگوں نے گٹر میں چھپ کر جان بچائی۔ پھر آرمی نے آکر جان بچائی۔[۳۸]

یہ ان وفادار محبِ وطن لوگوں میں سے تھے جنہوں نے ہر بار مملکتِ خداداد کے لئے جان ہتھیلی پر رکھی ۔ایسے قابلِ قدر لوگوں کے ساتھ ساتھ یقیناً ہم میں ایسے بھی کردار تھے جو ۱۹۴۷ء کی قربانیاں بھلا بیٹھے تھے جس کا خمیازہ ہم نے ملک ٹوٹنے کی صورت میں بھگتا۔ ان کا کردار ان غداروں کا تھا جو ایک شخص نہیں بلکی پوری قوم کے مجرم تھے۔ جن کی غلطیوں نے پورے ملک کو شرمسار کیا۔ مسعود مفتی اس حوالے سے اپنے نظریات پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> مملکتِ خداداد پاکستان بنا کر خدا کو دھوکہ دینے میں تو ہم بنی اسرائیل کو بھی مات کر گئے اور ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جس میں ایک دیانت دار آدمی کے لئے ذہنی اذیت اور ذاتی تکلیف کے علاوہ کچھ نہیں۔ آج کی رات اس وعدہ خلافی کی سزا ہے جو ہم نے ۱۹۴۷ء والی رات کا وعدہ پورا نہ کر کے کی ہے۔[۳۹]

مسعود مفتی نے اپنی غیر افسانوی نثر میں جن حالات و واقعات کو پیش کیا ان میں ذاتی تجربات کے ساتھ ساتھ ان قابلِ بھروسہ عینی شاہدین کے بیان بھی شامل تھے جو اس سانحے کا شکار ہوئے۔ ان لوگوں نے در حقیقت ملک کی خاطر قربانیاں دی تھیں اور اب خود بے سروسامانی کی حالت میں ایک شہر خموشاں بنے بیٹھے تھے۔ وہ یوں سراپا سوال تھے جس کا جواب خود ادیب کا قلم بھی دینے سے قاصر تھا۔ مسعود مفتی نے اپنی آنکھوں سے جن ذبح خانوں کی حالت دیکھی وہ کسی بھی انسانیت کے حامل شخص کو لرزا دینے کو کافی تھی۔ اس کی سچائی بہت سے محققین اور مصنفین کی کتابیں ثابت کرتی ہیں۔ سرمیلا بوس نے اپنی کتاب کے سلسلے میں جو انٹرویو کئے ان کے مطابق:

> عورتوں، مردوں اور بچوں کو چھریوں سے، گولیاں مار کر ہر ممکن طریقے سے قتل کیا جا رہا تھا۔ لاشوں کو دریا برد کر دیا گیا۔ بہاریوں کے مطابق بنگالیوں نے "پھانسی گھاٹ" مقتل قائم کر رکھے تھے جہاں وہ بہاریوں کو ہلاک کرتے تھے۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی کہ کمرے میں موجود تمام افراد نے ایک ساتھ اثبات میں سر ہلایا۔۔۔ جیسا کہ بنگالی خود اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے ہزاروں افراد کو قتل کیا۔[۴۰]

یہ ایک ایسا اعتراف تھا جو بنگالیوں نے تو سرِ عام کیا مگر مسعود مفتی اور ان جیسے کئی محبِ وطن پاکستانی اس احساس میں ختم ہوئے جا رہے تھے کہ وہ تشدد کا نشانہ بننے والوں کا سامنا کیسے کریں۔ وہ کس منہ سے کہیں کہ وہ ہم وطن ہیں۔ ایک ایسے وطن کے باسی ہیں جہاں مرنے والے بھی اپنے تھے اور مارنے والے بھی مگر اضافی بات یہ تھی کہ غیروں کی مکمل حمایت بھی شاملِ حال رہی تھی۔ مگر احساسِ ندامت اور اپنے پیاروں کی زندگیوں کا زیاں سب پر

بھاری تھا۔ مسعود مفتی نے خانہ جنگی کے بعد جب کیمپ کا دورہ کیا تو وہاں کسمپرسی کی جو انتہا دیکھی وہ نا قابلِ بیان تھی۔ لٹے پٹے لوگوں کی حالتِ زار ان سے بہتر کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ لکھتے ہیں:

> عورتوں کی نظروں میں سوال تھے۔ مردوں کی آنکھوں میں طعنے تھے اور مجھے کچھ احساسِ گناہ سا ہونے لگا کہ ہم ان کی مصیبت کا تماشہ دیکھنے آئے ہیں۔[41]

یہ اور ان جیسی کئی سچی کہانیاں ڈھاکہ کی ویران سڑکوں پر کسی بھٹکی ہوئی روح کی مانند تھیں۔ اُجاڑ گھر، کھلے کواڑ اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ کبھی یہ آنگن آباد تھے۔ ان کو ویران کرنے والے کیا ہوئے۔ یہ ایک ایسی خوفناک حقیقت ہے جس سے ہم آج بھی نظریں چرانا چاہتے ہیں۔ بنگالی قومیت کے نام پر جس بربریت کا مظاہرہ کیا گیا وہ اپنی جذباتی و نفسیاتی جڑیں کہیں اور رکھتا تھا۔ مسعود مفتی کے نزدیک اس سے بھی خطرناک ایک اور حقیقت تھی جس کے متعلق رائے دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ:

> ایسی کہانیاں قدم قدم پر بکھری ہیں۔ یہ بذاتِ خود افسوس ناک ہے مگر جو حقیقت اس سے بھی زیادہ خوفناک ہے وہ یہ کہ آج بھی مشرقی پاکستان کے کئی لوگ اس بربریت کی مذمت کرنے کو تیار نہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو اس کے باوجود مظلوم گردانتے ہیں۔ سیاسی سطح پر نہیں بلکہ تشدد کی سطح پر بھی چند لوگوں نے اسے ضرور برا بھلا کہا ہے مگر بہت بڑی تعداد صوبائی تعصب سے اندھی ہو گئی ہے کہ ان کو یہ کوئی ظلم نظر نہیں آتا بلکہ اُلٹا فوج کو مطعون کرتے ہیں کہ انہوں نے ظلم کیا۔[42]

مسعود مفتی اور بہت سے صاحبِ عقل و دانش آج بھی یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ کیا یہ ہمارا قومی رویہ تھا یا مخصوص وقت میں پیدا ہونے والی کوئی نفسیاتی کیفیت تھی۔ جتنی اذیت اور خوف و دہشت سے غیر بنگالیوں کا قتلِ عام کیا گیا وہ یقیناً اپنے نفسیاتی محرکات بھی رکھتی ہے۔ اس قدر اذیت کے بعد خود کو قابلِ رحم حالت میں پیش کرنا ایک لمحہ فکریہ ہے۔ کیا ہم بحیثیت قوم کبھی ایک بن ہی نہ پائے تھے جو تعصبات کا دریا ہمیں بہا کر لے گیا؟ اس قدر اذیت اور تشدد سے بھرپور رویے آج بھی سراپا سوال ہیں کہ بنگالی قوم آج بھی خود کو مظلوم گردانتی ہے۔ یقیناً اس میں بہت سے بے گناہ بھی ہوں گے مگر وہ جو مکتی باہنی اور ہندوؤں کا آلہ کار بنے وہ بھی تعداد میں کم نہ تھے۔ اسی نفسیاتی حالت کو بنگالی مصنف نرادسی چوہدری نے بھی اپنے قلم سے محفوظ کیا۔ ان کا نظریہ سرمیلا بوس نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ:

> مشرقی بنگال کے مسلمانوں میں مغربی پاکستان کے خلاف شدید اشتعال پایا جاتا ہے لیکن زیادہ پریشان کن بات یہ ہے کہ ان مشکلات اور تکالیف سے نکلنے کے لیے بھرپور اقدامات کرنے کے بجائے بنگالی

اپنی تکالیف کو بنیاد بنا کر اور خود کو قابل رحم حالت میں پیش کر کے حریص نظروں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے تھے۔ میرے اپنے خیال میں ایک جذباتی اطمینان کے لیے خود کو قابل رحم حالت میں پیش کرنا اور مشکلات کے نام پر کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرنا، تمام بنگالیوں کا وطیرہ بن چکا ہے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان۔ [۴۳]

ایک بنگالی مصنف کی یہ رائے مسعود مفتی کے قائم کردہ نظریات سے بہت حد تک مماثلت رکھتی ہے ۔ تشدد کے اتنے واقعات کے بعد بھی بنگالیوں کی نگاہوں میں ندامت کے آثار کہیں بھی نہیں تھے۔ مگر یہاں مسعود مفتی ایک ایسے پروپیگنڈے کا ذکر کرنا بھی لازم خیال کرتے ہیں جو ان کے مطابق بنگالیوں کے ایسے رویوں کی ایک بہت بڑی وجہ تھا۔ ان کے خیال میں اس قوم میں صوبائیت اور علاقائی تعصب پیدا کرنے میں ہندوؤں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے نہایت ساز بازی سے تلوار کے ساتھ ساتھ قلم سے بھی کام لیا اور ہماری نسلوں میں وہ زہر منتقل کیا جس نے نسلوں کو تباہ کر ڈالا۔

وہ جو تحریک پاکستان میں اپنا کردار ادا کرتے رہے تھے پاکستان بننے کو ایک سیاسی غلطی تصور کرنے لگ گئے تھے۔ یہ ساری فصل ایک رات میں پک کر تیار نہیں ہوئی تھی۔ اس کی پشت پناہی ہندو اساتذہ نے بڑی جانفشانی سے کی تھی۔ مسعود مفتی بحیثیت سیکرٹری تعلیم اور ادیب اس نظریے کی جڑوں سے واقفیت رکھتے تھے۔ ان عوامل کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

نظریاتی اساس رکھنے والی قوم کا یقین جب متزلزل ہو جائے تو وہ اپنے ہاتھوں اپنا گریبان چاک کرتی ہے۔ دامن دریدہ کرتی ہے اور اس کے دشمن نہ صرف اس پر ہنستے ہیں۔ بلکہ گلی کے آوارہ لڑکوں کی طرح پتھر مار مار کر لہولہان کر دیتے ہیں۔ [۴۴]

ہماری نظریاتی اساس کو بہت شدت سے ضرب لگائی گئی تھی اور اس کے نتائج پوری قوم نے دیکھے۔ مسعود مفتی کے نظریات اس گہرائی سے نتائج کا جائزہ لیتے ہیں کہ قاری کو حقائق پر مبنی ادب سے آشنائی ہو۔ فسادات کے دوران اور بعد کے تلخ تجربات سے صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر بھی مزین ہے۔ یہ دونوں سقوط کے عینی شاہد تھے اور عینی شاہد کا کردار اگر ایک ادیب کا ہو تو تاریخ کا زیادہ واضح رخ دیکھا جا سکتا ہے۔ ادیب ہونے کے ساتھ ساتھ صدیق سالک کا تعلق فوج سے بھی تھا۔ جہاں ان کے تجربات میں جنگی حالات وواقعات کی درست تصویر بھی شامل تھی۔ ۱۹۷۱ء کی خانہ جنگی میں فوج کا کردار کیا تھا اور مظالم کی شرح علاقوں کے حساب سے کیا تھی اس کا تجزیہ بھی صدیق سالک کی تحریروں میں ملتا ہے۔ بنگالیوں کی فوج میں بغاوت سے لے کر، خانہ جنگی اور مظالم کی روداد جیسے بہت

سے دلخراش واقعات و تجربات کو صدیق سالک نے اپنی تحریر میں سمیٹا ہے۔ عسکری زندگی سے وابستہ ہونے کی بنا پر صدیق سالک کے تجربات مسعود مفتی کی نسبت جنگی حالات و واقعات کی زیادہ درست تصویر پیش کرتے ہیں۔ کشتیا، جیسور، کھلنا، چٹاگانگ، کومیلا اور ایسے بہت سے علاقے جہاں افواج پاکستان کو آپریشن کرنے اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے بھیجا گیا تھا ان کا احوال صدیق سالک کی تحریر کا حصہ ہے۔ ظلم و بربریت کے واقعات کا احوال بھی جنگی کاروائیوں کے ساتھ ملتا ہے۔ صدیق سالک کا تعلق چوں کہ افواج پاکستان سے تھا اس بنیاد پر فوج کا نقطہ نظر بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

سقوط ڈھاکہ کے وہ کردار جو حالات بگاڑنے میں پیش پیش تھے حالات قابو سے باہر ہوتے دیکھ کر اسی فوج سے مدد کی درخواست کرنے لگے تھے۔ یہاں ایک صاحب نظر شخص یہ سمجھنے سے محروم تھا کہ اسی قوم کی فوج سے شدید نفرت ان حالات میں آڑے کیوں نہیں آئی۔ ان بگڑتے حالات اور فوج کی امداد سے متعلق لکھتے ہیں:

> شفیع الاعظم کے علاوہ صوبائی ہوم سیکرٹری اور انسپکٹر جنرل آف پولیس نے بھی مارشل لاء حکام کو اسی نوعیت کے ٹیلی فون کیے اور فوج بلانے پر زور دیا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایک طرف بنگالیوں کو فوج سے اتنی نفرت ہے اور دوسری طرف اس کو بلانے پر اتنا اصرار ہے۔ آخر کیوں؟ [۴۵]

اس سوال کا جواب ان حالات نے دیا جب بگڑتی صورتحال کو سنبھالنے کے لیے فوجی کاروائی ہوئی۔ عوامی لیگ کے کارکنوں کی شدید بغاوت اور افواج کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے کے نتیجے میں گولی چلائی گئی۔ اس کے بعد کے ہنگامے اور عوامی لیگ کی اشتعال انگیز کاروائیاں کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔ مجیب الرحمٰن کی پرزور حمایت پر فوج کو بیرکوں میں واپس بھیج دیا گیا اور امن وامان کی ذمہ داری مجیب الرحمٰن نے اپنے ذمہ لیتے ہوئے غیر بنگالیوں کے ساتھ فسادات کی وہ تاریخ رقم کی جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس ظلم و بربریت کا شکار صرف عام غیر بنگالی نہیں بنے تھے بلکہ فوج کو بھی نیست و نابود کرنے میں مجیب الرحمٰن کے حامیوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ صدیق سالک یہاں افواج پاکستان کی اس جرات کی بھی داد دیتے ہیں جب اتنے مظالم کے باوجود ان کے ڈسپلن میں کمی نہیں آئی۔ لکھتے ہیں:

> مجیب نے اشتعال انگیزی کا ہر حربہ آزمایا۔ فوج کے لیے ریل اور سڑکیں استعمال کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ مقامی ٹھیکیداروں کو راشن سپلائی کرنے سے روک دیا اور جہاں ان کا سامنا ہوتا، انہیں گالیاں دی جاتیں، مگر آفرین ہے ڈسپلن کے ان مجسموں پر کہ انہوں نے خشک راشن کی دال اور عوامی لیگ کی تربتر گالیاں کھا کر گزارہ کر لیا، مگر فوجی ڈسپلن کے خلاف کوئی حرکت نہ کی۔ [۴۶]

بات صرف گالیوں اور راشن پانی تک محدود نہ تھی غیر بنگالیوں کے قتل عام میں ،بچوں ، عورتوں اور بالخصوص فوجی افسران کے اہل خانہ کو بہت بے دردی سے قتل کیا گیا۔ بچوں کو ذبح کیا گیا، عورتوں کی عصمت دری کے واقعات سامنے آئے ان حالات میں بعض فوجی اپنے اہل خانہ کی ایسی حالت دیکھ کر ذہنی توازن بھی کھو بیٹھے ۔یہاں یہ نکتہ قابل غور ہے کہ آخر وہ کون سا ایسا نظریہ تھا جو نظریہ پاکستان سے بھی زیادہ مستحکم نکلا۔ باغیوں کی سوچیں کس نہج پر چل نکلی تھیں کہ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ صدیق سالک کا تجربہ ان جنگی کاروائیوں کو بھی مد نظر رکھے ہوئے تھا جو باغیوں کی سرکوبی کے لیے کی گئیں۔ لکھتے ہیں:

> حسب الحکم صبح چار بجے تک یونیورسٹی کی عمارت کو (اقبال ہال اور جگن ناتھ سمیت) مسخر کیا جاچکا تھا ،لیکن وہاں سے پھوٹنے والا بنگالی قومیت کا نظریہ کافی عرصے تک ناقابل تسخیر رہا۔۔۔ شاید نظریوں کو مسخر کرنا توپوں اور ٹینکوں کے بس کی بات نہیں۔[۴۷]

قومیت پرستی کا بیج ان کے ذہنوں میں ایک تناور درخت کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ ان لوگوں کے لیے مجیب الرحمٰن کا کردار کسی ہیرو سے کم نہیں تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان کے اقدام متحدہ پاکستان کی سالمیت کو داؤ پر لگا چکے ہیں۔ ان حالات میں ملک کا متحد رہنا کسی دیوانے کا خواب تھا۔ سفاکیت کی تمام حدود تجاوز کرنے کے بعد بھی بنگالی قوم پرستوں کے دلوں میں مجیب الرحمٰن بستا تھا۔ صدیق سالک کے تجربات ومشاہدات اس بات کے شاہد تھے کہ وہ اب بھی بنگلہ بندھو کی رہائی کے منتظر تھے۔ وہ کھلم کھلا مخالفت کرنے کے قابل نہ ہوتے تو لہجوں میں بے اعتنائی رکھتے تھے۔ غیر بنگالیوں پر کیے گئے ان کے مظالم ایک ایسی تاریخ رقم کرتے ہیں جس کی ملت اسلامیہ میں مثال نہیں ملتی ہے۔

بنگالیوں کی طرف سے ڈھائے گئے مظالم اور مجیب الرحمٰن کی سفاک حکمت عملیاں جو نتائج مرتب کر رہیں تھیں وہ بھی دنیا کو درست انداز میں نہیں دکھائے گئے۔ پہلا نقصان ہم نے اپنے لوگوں کے قتل عام کی صورت میں اٹھایا تو دوسرا نقصان ان افواہوں کی صورت میں جو پوری دنیا میں مغربی پاکستانیوں اور افواج کو ظالم بتا رہی تھیں۔ اس سلسلے میں حکومت کی خاموشی قابل غور و قابلِ مذمت تھی۔ درست اعداد و شمار سے اور مشرقی پاکستان میں ہوئے مظالم سے مغربی پاکستانیوں کو آگاہ نہ کرنا بھی ہمارے حق میں بہت برا ثابت ہوا۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک دونوں کو عینی شاہدین کی حیثیت سے اس بات کا مکمل ادراک تھا اور اس کا اظہار انہوں نے اپنے طور پر کیا۔ مسعود مفتی اس حوالے سے کہتے ہیں کہ:

ہمارے ذرائع ابلاغ اتنے غیر مؤثر ہیں اور اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کی کوشش اتنی ادھوری ہے کہ ہمارے ہر عمل کی تشہیر ظلم کے طور پر کی جاتی ہے۔[۴۸]

اخبارات اور ریڈیو جس قدر ان مظالم کی خبروں کو چھپاتے رہے اس قدر ہماری قومی و بین الاقوامی حیثیت کمزور ہوتی گئی۔ اگر درست انداز میں بروقت تمام مظالم سے عالمی دنیا کو آگاہ کرایا جاتا تو مغربی پاکستان کا کردار کبھی بھی اس قدر مشکوک نہ ہوتا۔ صدیق سالک بھی پاکستان کے کردار کے حوالے سے عالمی دنیا کی رائے سے بے خبر نہیں تھے۔ انہیں اس بات کا ادراک تھا کہ دیگر ممالک کے اخبار پاکستانی فوج اور لوگوں کے حوالے سے جو بے بنیاد خبریں نشر کر رہے ہیں ان کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے۔ کیوں کہ ہمارے حکام کی طرف سے نہ ان افواہوں کی تصدیق کی گئی اور نہ ہی تردید، ایسے میں اپنا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> جو قیامت غیر بنگالیوں پر ٹوٹی، اس کا نوحہ نہ سرکاری اعلامیوں میں درج ہوا نہ اخبارات میں۔ ان کا خون ان کی آہوں کی طرح بے اثر گیا۔ مجھ سمیت کئی لوگوں نے حکام بالا سے کہا کہ عوامی لیگ کے دورِ حکومت میں ہونے والے ان مظالم کی تفصیلات چھپنی چاہیں۔ مگر وہ نہ مانے۔ ان کا اقرار یہ تھا کہ یہ دلخراش واقعات پردہ راز میں ہی رہنے چاہیں۔[۴۹]

دونوں مصنفین نے یہ نظریہ پیش کیا کہ درست واقعات مغربی پاکستانیوں کو معلوم ہونے چاہیے تھے مگر بر وقت ایسا نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بنگالی خود کو معصوم اور افواج پاکستان کو ظالم ثابت کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئے۔ دفاعی شکست کے ساتھ ساتھ یہ نظریاتی شکست بھی ہمارے حصے میں آئی۔ جہاں قومیت پرست بنگالی اور ملک دشمن عناصر جیت گئے اور مصلحت پسند مغربی پاکستانی اور حکام آج تک خود کو ثابت نہیں کر پائے۔ خانہ جنگی کے بعد جب بنگلہ دیش کا قیام عمل میں آگیا تو ایسے میں بہت سے سول سروس کے ملازمین اور افواج پاکستان کو بھارتی فوج کی زیر حراست رکھا گیا۔ یہ وہ دورِ حیات تھا جو ہر پاکستانی پر بہت کڑا ثابت ہو رہا تھا۔ میدان جنگ کی شکست کے ساتھ ساتھ ملک ٹوٹنے کا احساس زیاں بھی کمر توڑ رہا تھا۔ یوں قید و بند کی صعوبتیں زیادہ بری طرح اثر انداز ہو رہی تھیں۔ ایسے میں بھارتی حکام اور سپاہیوں کا ہتک آمیز رویہ بھی نفسیاتی طور پر اثر انداز ہوا۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک دونوں نے دوران قید روا رکھے جانے والے سلوک کے متعلق اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ بھارتی سپاہی جسمانی کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اذیت سے بھی دوچار کیا کرتے تھے۔ ایسے دشمن کی قید کسی ادیب کی حسوں کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی تھی۔ دشمن کی قید میں حالت زار کچھ اس انداز سے بیان کرتے ہیں:

جب دشمن سر تا پیر ریاکاری ہو۔ تن کا اجلا اور من کا کالا ہو۔ چھوٹا انسان اور نقلی بھگوان ہو۔ ایسے دشمن کی قید ایک ناقابل بیان عذاب تھی جو رگوں میں دوڑتے پھرتے لہو کو آنکھوں سے بھی نہیں ٹپکنے دیتی اور دم بدم سیال نفرت میں کشید کرتی رہتی تھی۔ [۵۰]

مسعود مفتی ان رویوں کا بھی بغور جائزہ لیتے ہیں جو بھارتی سپاہیوں یا حکام کی جانب سے روا رکھا جاتا تھا۔ ان کی دور رس نگاہیں ان نفسیاتی حربوں کا بھی بغور جائزہ لے رہی تھیں جو غیر محسوس انداز میں بھارتی فوج منتقل کرنا چاہ رہی تھی۔ ایسے میں جب وطن کی یاد بھی ستانے لگتی تو غم دوہرا ہو جاتا۔ اپنے دیس کی قید ہوتی تو کم از کم کسی اپنے کا چہرہ تو نظر آجاتا مگر دشمن کی قید ان سب باتوں سے مبرا تھی۔ مسعود مفتی لکھتے ہیں:

دشمن کی قید گھنگھور گھٹا کی طرح مکمل ہوتی ہے۔ بے داغ سیاہی، کڑکتی چمکتی بجلیوں سے لرزتی ہوئی، پابندیاں ظلم کی کوکھ سے نکلتی ہوئی، ملاقات کے تصور سے بھی خالی اور عملے کی جانی دشمنی سے شرابور ۔۔۔ ارد گرد انسان کہیں نہیں ہوتا۔ فقط دشمن ہوتا ہے۔ [۵۱]

مسعود مفتی کا یہ نظریہ ان تمام تجربات کا نچوڑ ہے جو دوران قید انہوں نے برداشت کیے تھے۔ قیدی کے دل و دماغ کی گھٹن جتنے واضح الفاظ میں بیان کی وہ انکی بے بسی کو ظاہر کرتی ہے۔ اس حوالے سے صدیق سالک کے نقطہ نظر کا جائزہ لیں تو انہوں نے بھی بہت واضح انداز میں بھارتی حکام و سپاہیوں کے سفاک چہرے سے پردہ اٹھایا ہے۔ ان کے ہر اس جسمانی و نفسیاتی حربے پر بات کی ہے جو پاکستانی قیدیوں کی عزت نفس کو کچل رہے تھے۔ دوران سیل اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

مجھے تو ہر پندرہ دن کے بعد ایک غلیظ اور بدزبان محتسب سے واسطہ پڑتا تھا۔ جو طرح طرح کی اذیتیں دے کر مجھے توڑنے کے درپے تھے اس کے حربوں سے میں بجھ تو ضرور گیا تھا لیکن ٹوٹا ہرگز نہیں تھا۔ [۵۲]

پاکستانی قیدیوں کو دی جانے والی اذیت صرف جسمانی تشدد تک محدود نہ تھی اس میں وہ نفسیاتی حربے بھی استعمال کیے جاتے جو قیدیوں کے لیے کہیں زیادہ اذیت ناک تھے۔ کبھی کسی مقرر کو قیدیوں کے دماغ میں دو قومی نظریے کے خلاف نظریات بھرنے بھیج دیا جاتا تو کہیں انسان دوستی کا سبق پڑھاتے نمائندے ہندو مسلم کو ایک کرنے کی کوشش کر رہے ہوتے تھے۔ تعصب کی اس جنگ میں ہندوؤں نے بھرپور کوشش کی کہ ہر شخص کو ذہنی اذیت سے اس قدر دوچار کریں کہ وہ کسی شخص کا بھی وجود برداشت نہ کرے انہی حالات کے پیش نظر صدیق سالک اپنا نقطہ اس انداز میں واضح کرتے ہیں:

ہمارے آقاؤں نے ہماری مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی، انھوں نے نہ صرف کیمپ کے اندر بھائی کو بھائی سے لڑوانے اور صوبائی تعصب کو ہوا دینے کی پوری کوشش کی بلکہ چیدہ چیدہ دانشور کیمپوں میں بھیج کر ہمیں (برین واش) کرنے کے بھی کئی جتن کیے۔ [۵۳]

صدیق سالک کے اس بیان کی تصدیق ان لوگوں کی سرگزشت سے بھی کی جاسکتی ہے جو انہی کی طرح ۱۹۷۱ء میں قیدی کی حیثیت سے رہے ان میں کرنل سید مقبول حسین کی لکھی گئی تحریریں زندہ رہے گا پاکستان اور کیمپ ۳۵ کا جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ اپنی کتاب کیمپ ۳۵ میں لکھتے ہیں:

کیمپ میں اکثر باہر سے لیکچر دینے کے لیے لوگ بلائے جاتے یہ بھارت کی ہم پر نفسیاتی جنگ کی یلغار کا حصہ تھا۔ اسی ضمن میں ایسی کتابیں بھی پڑھنے کو دی جاتیں جن میں بھارتی برتری کا پہلو موجود ہو۔ خاص طور پر Pakistan Cut to Size جیسی کتابیں ہمیں مہیا کی گئیں۔ [۵۴]

اسیری میں بھارتی سپاہیوں کی طرف سے پیش کردہ لوازمات صرف یہیں تک محدود نہ تھے بلکہ بیمار سپاہیوں کو اس بات پر بھی ڈرایا دھمکایا جاتا تھا کہ اگر انہوں نے حکام کے جاری کردہ احکامات کی خلاف ورزی کی تو ان کا نام پاکستان بھیجے جانے والے قیدیوں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے گا۔ اس طرح نفسیاتی دباؤ کے حربے استعمال کر کے پاکستانی قیدیوں کو یرغمال بنایا جاتا تھا صدیق سالک اس حوالے سے کہتے ہیں:

مجھے ان مریضوں پر ترس آنے لگا جن کے اعصاب سے بھارتی حکام کھیل رہے تھے۔۔۔۔ بات بات پر دھمکیوں کا دور شروع ہو جاتا کہ اگر ریڈ کراس کے سامنے خوراک یا دوائی کی شکایت کی تو تمہارا نام فہرست سے نکال دیا جائے گا۔ [۵۵]

بھارتی حکام کی جارحیت جہاں بطور قیدی جسمانی و نفسیاتی اذیت میں مبتلا کرتی رہی وہیں ادیب کا ذہن ماضی کے ان پردوں سے جھانکنے لگتا جو تاریخ کے سٹیج پر آویزاں تھے۔ یہ خیال کسی بھٹکے مسافر کی طرح آنکلتا کہ کاش سقوطِ ڈھاکہ جیسا مرحلہ ہماری تاریخ کا حصہ نہ ہوتا۔ دل بے اختیار چاہتا کہ اس مسئلے کا کوئی سیاسی حل نکال لیا جاتا تو آج ہم متحدہ پاکستان کو لے کر چل رہے ہوتے۔ یہاں مسعود مفتی اور صدیق سالک کے نظریات ان سیاسی غلطیوں کو بھی سامنے لاتے ہیں جو کسی طور رونما نہیں ہونی چاہیے تھیں۔ وہ لمحہ جب فوجی ایکشن سے حالات قابو کر لیے گئے اس بات کا متقاضی تھا کہ اب مل بیٹھ کر معاملات سلجھا لیے جائیں۔ یہی بقا کا راستہ تھا مگر اقتدار کی ہوس فنا چاہتی تھی ۔ مسعود مفتی اس حوالے سے اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میرے خیال میں صورتحال ایسی نہیں کہ درست نہ ہو سکے۔ مناسب طرز عمل سے ابھی بھی صبح کا بھولا گھر واپس لایا جا سکتا ہے۔ محدود فوجی ایکشن کے بعد جو فائدے حاصل ہوئے تھے ان کو فوجی کی بجائے سیاسی اور انتظامی طور پر مستحکم کرنے کی ضرورت تھی۔۔۔ مگر یوں لگتا ہے کہ اس نقطے کو سمجھا نہیں گیا۔[۵۶]

مسعود مفتی کے اس نظریے کی حمایت میں حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا بیان بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں اول تو فوجی ایکشن کو درست تسلیم نہیں کیا جاتا اور اگر یہ حل تھا بھی تو محدود پیمانے پر کیا جاتا۔ اس کے بعد سیاسی طور پر معاملات نپٹائے جاتے۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں درج بیان ہے کہ:

اس نکتہ پر ایڈمرل احسن کی توجیہ یہ تھی کہ جب یکم مارچ کو التواء کا اعلان ہوا تو انہوں نے فوری طور پر صدر کو ڈھاکہ آنے پر آمادہ کرنے کی سر توڑ کوشش کی جنرل یعقوب نے بھی ان کے خیال کی تائید کی کہ سیاسی حل سے ہی مسئلہ سلجھ سکتا ہے لیکن دوسرا واحد متبادل حل فوجی کاروائی تھا اور اس بھرپور آپریشن سے سیاسی مذاکرات کا دروازہ حتمی طور پر بند ہو گیا۔[۵۷]

فوجی کاروائی اگر محدود پیمانے پر بھی کی جاتی اور اس کے بعد سیاسی حل نکالا جاتا تو حالات اس قدر بے اثر نہ ہوتے جتنے ہوئے۔ صدر پاکستان اور سیاسی قائدین اگر منظم طریقے سے چلتے تو حالات کو سلجھایا جا سکتا تھا مگر کرسی پر بیٹھنے کا شوق آدھا ملک لے ڈوبا۔ مسعود مفتی سیاسی زاویہ نگاہ سے اس عمل کو بالکل غلط گردانتے ہیں لکھتے ہیں:

اس اکثریت کو اگر منظم کیا جاتا تو وہ حیرت انگیز قوت تھی مگر مارچ کے بعد منظم کرنے کے لیے سیاسی عمل کی ضرورت تھی گولی کی نہیں اور سیاسی عمل کے ساتھ خلوص کی ضرورت تھی، مصلحتوں کی نہیں۔ ملک کی بدقسمتی تھی کہ سیاسی عمل اور خلوص دونوں مفقود تھے۔[۵۸]

سیاسی تصفیے کے حوالے سے صدیق سالک کا نظریہ بھی مسعود مفتی کی تائید کرتا محسوس ہوتا ہے۔ افواج پاکستان کا حصہ ہونے کے باوجود ان کی نگاہ میں اولین ترجیح مذاکرات کو حاصل تھی کیوں کہ یہ ہی وہ راستہ ہوتا ہے جس سے ملکی سالمیت کو برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ مگر ملکی سالمیت ایسے شخص کے ہاتھ میں تھی جس کا اپنا وجود بھی محفوظ نہ تھا۔ ایسے میں وہ ملکی سالمیت کو کیسے سنبھالا دیتا۔ صدیق سالک کہتے ہیں کہ:

یحییٰ خان کے جرنیل فلیگ سٹاف ہاؤس میں بیٹھے ان کی سرکوبی کی تیاریاں کر رہے ہیں اور شہر میں مذاکرات کا ٹنٹا محض مزید وقت حاصل کرنے کا ایک بہانہ ہے حالانکہ حقیقت حال یہ تھی کہ فوجی

قیادت کی اولین ترجیح سیاسی مذاکرات کی کامیابی تھی اور صرف ناکامی کی صورت میں فوجی کاروائی کا راستہ اپنایا جاسکتا تھا۔ [۵۹]

ہتھیاروں کی زبان اسی صورت استعمال کی جاتی ہے جب زبانی کلامی معاملات کو نہ سلجھایا جاسکے مگر ہماری ملکی تاریخ میں حالات اس کے بالکل برعکس تھے۔ ملک کو توڑنا مقصد تھا سو توڑ دیا گیا۔ ملک کا ٹوٹنا کسی بھی شخص کے لیے اذیت ناک ہوتا ہے اور محب وطن ادیب کے لیے یہ نہ بھلائے جانے والا سانحہ ہوتا ہے۔ وطن دو ٹکڑے ہو گیا مگر آج بھی ہم اس شکست کی کھائی میں گرے باہر نکلنے کی صدا لگا رہے ہیں۔ آج بھی تاریخ ہم سے سوال کرتی ہے کہ ہم نے اس سانحے سے کیا سبق سیکھا۔ کیا ان لسانی تعصبات کو ختم کیا گیا جو ملک ٹوٹنے کی وجوہات میں شامل تھے؟ کیا ہمیں مخلص حکمران نصیب ہوئے؟ کیا قومیت پرستی ختم ہوئی؟ یہ اور ایسے بہت سے سوالات اس وقت بھی صاحب علم و نظر لوگوں کو احتساب کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتے تھے۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک بھی ان اہل دل اور محب وطن لوگوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ مسعود مفتی کا احتسابی رویہ بحیثیت پاکستانی اور مسلمان ہمیں قرآن کی روشنی میں اپنا اصل چہرہ دکھاتا ہے۔ بحیثیت قوم ہم نے جو کچھ اس ملک کو دیا ہمیں وہی لوٹایا گیا۔ مسعود مفتی کہتے ہیں:

> جو کچھ ہماری قوم کے ساتھ ہوا ہے۔ وہ وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا۔ بلکہ یہ بھی خدائے تعالیٰ کا کرم ہے کہ کم ہوا۔ ورنہ ریاضی کے ان فارمولوں کے مطابق تو بہت زیادہ ہو سکتا تھا۔ [۶۰]

پاکستان بنے اور ٹوٹے کئی سال بیت گئے مگر حکمرانوں سے لے کر عام عوام تک کوئی قابل ذکر تبدیلی رونما نہ ہوئی جس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکے کہ قوم اپنی غلطیوں کا ازالہ کرنا چاہتی ہیں وہ تمام برائیاں جو آدھا ملک کھا گئیں بدستور اپنی اصل حالت میں موجود ہیں۔ اس حوالے سے کرنل سید مقبول حسین جو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں قیدی تھے نے اپنے انٹرویو میں کہا کہ:

> ایسا لگتا ہے کہ لیڈر شپ اور عوام دونوں نے اس واقعے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ چھوٹے صوبوں کی حق تلفی، کرپشن، اقربا پروری اور سیاسی کرپشن بدستور جاری ہے جو کہ قوم و ملک کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔ [۶۱]

کرنل مقبول حسین کی یہ رائے اس بات کی دلیل ہے کہ اتنے برس بعد بھی ہم بحیثیت قوم اور انسان خود کو ان برائیوں سے نہیں نکال سکے جو بنگلہ دیش کے بننے کا سبب تھیں۔ قومیں جب احتساب کرنا چھوڑ دیں تو پھر یہ گلہ بھی بے بنیاد ہو جاتا ہے۔ کہ ملک ترقی کی راہیں طے نہیں کرتا۔ قومی و ذاتی برائیوں کی بنیاد پر قائم اور مستحکم ادارے کبھی بھی سود مند نتائج سامنے نہیں لاتے ہیں۔ یوں ملک پر وہ اقوام نگاہیں گاڑ لیتی ہیں جنھیں ہم دشمن عناصر کے نام

سے جانتے ہیں۔ مگر یہ قانون قدرت ہے کہ جب آپ خود احتساب نہیں کرتے تو خدا کی ذات آپ کے لیے ایسے حالات پیدا کرتی ہے کہ سوئی ہوئی قوم کو جگایا جاسکے۔ مسعود مفتی قوموں کے ایسے رویوں اور احتسابی عمل سے متعلق اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> ہم نے مذہب سے لے کر سیاست اور پھر روزمرہ زندگی تک ہر چیز کے لیے ایک ہی پیمانہ رکھا اور وہ تھا مصلحت وقت کا پیمانہ، جس نے صرف عقیدوں کو جنم دیا۔ بہت کیا تو الزام۔ اس سے آگے گئے تو دشنام۔ مگر احتساب کبھی نہیں۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔ جب خود احتسابی نہ ہو تو خدا محتسب باہر سے بھیجا کرتا ہے۔ یہ ابدی قانون ہے۔ تواریخی حقیقت ہے اور بار بار دہرائی جانے والی روایت ہے۔ [۶۲]

خود احتسابی کے اس عمل سے نہ گزرنا ہماری ایک اور بڑی حماقت ہے۔ آج بھی ملکی حالات کا جائزہ لیں تو تعصبات اپنا منہ کھولے ملتے ہیں۔ ہماری بحیثیت پاکستانی شناخت کم اور صوبائی لحاظ سے تقسیم زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس تقسیم نے ملک دو ٹکڑے کر ڈالا مگر لوگوں کی ذہنیت آج بھی غیر محسوس انداز میں تفرقہ پھیلاتی ہے۔

محمد دل شیر علی انصاری جنہوں نے سقوط ڈھاکہ کے سانحے میں رضاکارانہ طور پر جنگ لڑی اور قیدی رہے ہمیں انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے مقامی لوگوں کے تعصب پر بھی بات کی۔ وہ تعصب جو بنگلہ دیش میں بھی تھا اور آج پاکستان میں بھی ہے۔ وہ ایک ایسے محب وطن پاکستانی ہیں جو آج بھی اپنی شناخت ڈھونڈتے ہیں انہوں نے بتایا کہ:

> ہمیں لوگوں کے تعصب کا سامنا رہا۔ آج بھی لوگ یہی کہتے ہیں وہ دیکھ بہاری آرہا ہے وہ دیکھ بنگالی آرہا ہے کسی کی قومیت پر بات نہ کریں۔ ہمیں اس تعصب کا سامنا دونوں پاکستان میں کرنا پڑا۔ [۶۳]

یہ ایک ایسے محب وطن پاکستانی کا دکھ ہے جو دوبار ہجرت کرنے کے بعد بھی اپنی شناخت کا طلب گار ہے جسے آج بھی لوگ بہاری یا بنگالی تو کہہ کر بلاتے ہیں مگر پاکستانی نہیں کہتے۔ وہ ملک جس کے لیے ان کے آباؤاجداد جان سے گزر گئے خود انہوں نے جنگ لڑی زخم کھائے جن کے نشان آج تک ان کے جسم پر تمغوں کی طرح موجود ہیں وہی ملک ان کو تعصب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہے۔ یہاں کے باسیوں نے تاریخ سے کچھ نہ سیکھا۔

صدیق سالک کا نقطہ نظر مسعود مفتی کی نسبت مختلف انداز کا حامل ہے۔ افواج پاکستان سے تعلق کی بنیاد پر انہوں نے جو رائے قائم کی وہ اس محکمے سے متعلق ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے چند سال بعد ملکی حالات میں جو تبدیلی رونما ہوئی وہ اس کو عسکری طور پر دیکھتے ہیں۔ ایک محب وطن پاکستانی اور فوجی کی حیثیت سے وہ اس مثبت تبدیلی کا ذکر کرتے ہیں جو ان کے نزدیک ملک کے مستقبل کے لیے خوش آئند تھی۔ کہتے ہیں:

بے شک آج فوج کی وردی اور اس کا ظاہری رنگ ڈھنگ (حتیٰ کہ اس کا تنظیمی ڈھانچہ) برطانوی طرز کا ہے لیکن اس کی سوچ خاصی حد تک قومی رنگ میں ڈھل چکی ہے۔ اسکے ہیرو اپنے ہیں، اس کی اقدار اپنی ہیں، ان کی امنگیں اپنی اور اس کے خواب اپنے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ فوج میں یہ تبدیلی ایک خوشگوار پیش رفت ہے۔ [۶۴]

یہ تصویر کا وہ روشن رخ ہے جو افواج پاکستان سے وابستہ ہماری امیدوں کو بلندی عطا کرتا ہے۔ ملکی سالمیت نے جو دھچکہ برداشت کیا اس کے بعد وہ کسی اور دھچکے کی متحمل نہیں ہو سکتی ہے۔ اس حوالے سے حاجی نصیر الدین جو سقوط ڈھاکہ میں پاک آرمی کی معیت میں دشمن سے لڑے اور چٹا گانگ سے ہجرت کی تھی ہمیں انٹرویو دیا۔ وہ راولپنڈی کی بہاری کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔ اپنے انٹرویو کے اختتام پر انہوں نے وطن اور افواج پاکستان کی محبت اور تاسف بھرے لہجے میں کہا کہ:

پاکستان نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ ہم نے تین بار ہجرت کی لیکن ہمیں چھوڑ دیا گیا۔ ہم نے خود اپنی شناخت بنائی ہے۔ مگر مجھے پاکستانی ہونے پر فخر ہے میں ہر حال میں خوش ہوں۔ افواج پاکستان اور حکومت پاکستان کا خلوص دل سے احترام کرتا ہوں۔ [۶۵]

یہ اس محبت کا اظہار ہے جو آج بھی خون بن کر ان لوگوں کے دلوں میں دوڑتی ہے جنھیں یہ دکھ تو ہے کہ انہیں بطور پاکستانی وہ شناخت اور اہمیت نہ دی گئی جس کے وہ مستحق تھے مگر اس کے باوجود وہ افواج اور حکومت سے بہت محبت کرتے ہیں۔ یہ صرف ایک پاکستانی کا دکھ نہیں ہے بلکہ ہجرت کرنے والے ان سب لوگوں کو مشترکہ غم ہے جو وطنِ عزیز کی خاطر اپنی جانوں پر کھیل کر یہاں پہنچے۔ اب یہ ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ غلامی کی ٹوپی اتار کر اپنی شناخت کو تسلیم کرے اور ان لوگوں کی حیثیت تسلیم کریں جو ملک کو بچاتے بچاتے اس مقام پر آ گئے۔ کیوں کہ اسی میں ملکی سلامتی اور انسانیت کی بقا پوشیدہ ہے۔

مسعود مفتی اور صدیق سالک کے نظریات کا مجموعی طور پر جائزہ لیں تو سقوط ڈھاکہ کے ابتدائی محرکات سے لے کر احتساب تک ہر پہلو کو زیر بحث لایا گیا۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک ایسی ادبی شخصیات ہیں جو سقوط ڈھاکہ کے عینی شاہد تھے۔ ادبی و سیاسی طور پر باشعور ہونے کی وجہ سے وہ دونوں ان واقعات سے متعلق آگاہ تھے جو پاکستان بننے کے بعد سے ملکی سالمیت کے خلاف رونما ہوئے تھے۔ مسعود مفتی سیکٹری تعلیم اور صدیق سالک بطور کیپٹن افواجِ پاکستان سے وابستہ تھے۔ ان دونوں کی تعیناتی اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے کی گئی تھی۔ مگر بحیثیت ادیب اور عینی شاہد انہوں نے حالات و واقعات کو قلم بند کرنا لازم سمجھا۔ مسعود مفتی کے رفقاکار میں ایسے لوگ موجود تھے

جو قومیت پرست بنگالی کا مکمل نمونہ تھے اس کے ساتھ ساتھ وہ واقعات جو وقتاً فوقتاً رونما ہوئے مسعود مفتی کا بنگالیوں کی سوچ کے متعلق نظریہ واضح کرتے گئے۔ وہ ان حقائق اور اعداد و شمار سے بھی واقفیت دلاتے ہیں جو احساس محرومی کا موجب تھے اور حکام و افسران کے رویوں کو تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ صدیق سالک نے بھی مثالیں دے کر چند ایک ایسے واقعات پیش کیے جو بنگالیوں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں معاشی و معاشرتی تضادات بھی شامل ہیں۔

بطور سیکٹری تعلیم مسعود مفتی نے بہت واضح اور مدلل انداز میں تعلیمی نظام کی کوتاہیوں اور ان کے نتائج پر بحث کی ہے حکومت کا غیر ذمہ دارانہ رویہ اور ملک دشمن عناصر کا تعلیمی نظام میں عمل دخل بنیادی وجہ گردانتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان واقعات کو مثال بنا کر پیش کرتے ہیں جو بطور سیکٹری تعلیم ڈھاکہ میں ان کی زندگی سے وابستہ تھے۔ صدیق سالک اس حوالے سے مختصراً اپنا نقطہ نگاہ پیش کرتے ہیں جو ملک دشمن عناصر کے حوالے سے مسعود مفتی کی رائے سے مشابہت رکھتا ہے۔ تعلیمی نظام کے ساتھ ساتھ مسعود مفتی اس سانحے کے اہم کرداروں صدر یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو، شیخ مجیب الرحمٰن اور جرنل نیازی سے متعلق مختصراً اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں مگر اس مختصر بیان میں نہایت مدلل طریقے سے ان کی کوتاہیوں سے پردہ چاک کرتے ہیں۔ صدیق سالک اس حوالے سے وقتاً فوقتاً اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ فوج سے وابستگی کی بنیاد پر جنرل یحییٰ اور جنرل نیازی کے حوالے سے وہ تفصیلاً تنقیدی رائے کا اظہار کرتے ہیں اور تاریخ کے ان سفاک کرداروں کی سیاسی اور کسی حد تک ذاتی زندگی کے متعلق بھی واقعات پیش کرتے ہیں۔

ان کرداروں کی سیاسی جنگ کب عملی جنگ میں تبدیل ہوئی اس کا اندازہ عینی شاہدین سے بہتر کوئی نہیں لگا سکتا ہے۔ اپنے تجربات کی بنا پر دوران جنگ ہونے والے فسادات اور وحشیانہ قتل و غارت کا بیان مسعود مفتی کی نثر کا حصہ ہے۔ انہوں نے تشدد کا شکار ہونے والے غیر بنگالیوں کی روداد بھی بیان کی اور ایک واضح نظریہ پیش کیا ہے۔ صدیق سالک نے افواج پاکستان میں رہتے ہوئے فسادات کا جو عالم دیکھا اس کو مختصراً بیان کیا۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک کا افواہوں کے حوالے سے بھی نقطہ نگاہ ان کی تحریروں کا حصہ ہے۔ جہاں وہ دونوں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مغربی پاکستانیوں کو اگر بروقت مشرقی حصے کے حالات سے آگاہ کر دیا جاتا تو وہ ان افواہوں پر کان دھرتے جو عالمی سطح پر پاکستان اور افواج پاکستان کی ساکھ کو داؤ پر لگانے کا موجب بنیں۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد حالات کا جائزہ لیں تو بحیثیت قیدی ان دونوں شخصیات نے اپنے تجربات کو اپنی تصانیف کا حصہ بنایا۔ دوران بھارتی حکام اور سپاہیوں کے ناروا سلوک کے متعلق بھی اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔ مسعود مفتی نے اس حوالے سے مختصراً گفتگو کی جبکہ صدیق سالک تفصیلاً ان تجربات کو پیش کرتے ہیں جن کا سامنا انہیں قیدی کی حیثیت سے کرنا پڑا۔ وہ ان جسمانی و نفسیاتی تکالیف کو مد نظر رکھتے ہیں جو بھارت کی طرف سے پاکستانی قیدیوں کو پہنچائی گئیں۔ یہاں وہ ہندو ذہنیت کے ان پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتے ہیں جو سفاکی کی انتہا کو چھو رہے تھے۔

مسعود مفتی اور صدیق سالک کی سیاسی بصیرت اس انداز سے بھی دیکھی جاسکتی ہے کہ دونوں شخصیات نے سیاسی حل کو ترجیح دیتے ہوئے اپنی رائے پیش کی۔ ان کے خیال میں فوجی ایکشن سے پہلے اس مسئلے کا سیاسی حل لازم تھا مگر اقتدار کی بھوک آدھا ملک نگل گئی یہ وہ خطا تھی جو تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ مسعود مفتی نے قرآن پاک کی آیات مبارکہ کی روشنی میں قوم کا احتساب کیا اور ان نظریات کو پیش کیا جو ان کے خیال میں ہماری تنزلی کا سبب بنے۔ یہاں وہ فوجی رویوں کو جانچتے ہوئے احتسابی عمل کو ترجیح دیتے ہیں صدیق سالک افواج پاکستان سے وابستگی کی بنیاد پر ایک ایسے مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہیں جو وطن عزیز کو عظیم مملکت بنائے گا۔ دونوں شخصیات کی نظریاتی وابستگی ان کے نقطہ نگاہ کو واضح کرتی ہے۔ دو مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے باوجود ایک ہی ملک کے باسی اور سقوط ڈھاکہ کے عینی شاہدین کی حیثیت سے ان کے نظریات تاریخ کا درست رخ پیش کرتے ہیں۔ دونوں مصنفین کے یہی تجربات اور نظریات ہر دور کے قاری کو سقوطِ ڈھاکہ کے حقائق سے متعلق درست رہنمائی مہیا کرتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مسعود مفتی، ہم نفس، (لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۶ء)، ص ۵۱۔۵۲۔

۲۔ مقصودہ حسین، مسعود مفتی: شخصیت اور فن،(اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص۱۷۶۔

۳۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا،(لاہور:الفیصل پرنٹرز،۲۰۱۷ء)، ص۵۱۔

۴۔ ایضاً، ص۸۸۔

۵۔ ایضاً، ص۱۲۲۔

۶۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۳۳۔

۷۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے، (اسلام آباد:دوست پبلی کیشنز،۲۰۱۴ء)، ص۱۰۳۔

۸۔ ایضاً، ص۲۹۔

۹۔ محمد دل شیر علی انصاری، راقمہ سے براہ راست انٹرویو،(بہاری کالونی راولپنڈی:۸ دسمبر ۲۰۱۹ء)، دوپہر ۱:۱۵۔

۱۰۔ صدیق سالک،سیلوٹ،(لاہور: محبوب پرنٹرز ،۲۰۱۷ء)، ص۱۳۰۔

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۲۵۔

۱۲۔ محمد دل شیر علی انصاری ،راقمہ سے براہ راست انٹرویو،(بہاری کالونی راولپنڈی:۸ دسمبر ۲۰۱۹ء)، دوپہر ۱:۱۵۔

۱۳۔ مسعود مفتی، راقمہ سے واٹس ایپ انٹرویو، ۲۰ اگست ۲۰۱۹ء، شام ۶:۲۴۔

۱۴۔ مسعود مفتی، لمحے، (اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص۶۸۔

۱۵۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۸۲۔

۱۶۔ ایضاً، ص۱۵۳۔

۱۷۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۱۴۔

۱۸۔ صدیق سالک،سیلوٹ، ص۱۳۱۔

۱۹۔ کمال متین الدین، نسلوں نے سزا پائی بحران ڈھاکہ (۱۹۶۸ء - ۱۹۷۱ء) *(Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968-1971)*، ص۴۱۔

۲۰۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۵۷۔

۲۱۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۸۹۔

۲۲۔ ایضاً، ص۵۷۔

۲۳۔ ایضاً، ص۸۹۔

۲۴۔ عنایت اللہ، ہماری شکست کی کہانی، ص۲۳۔

۲۵۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص۲۳۴۔

۲۶۔ سرمیلا بوس، ڈھاکہ کہانی کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی (*Dead Reckoning Memories of the Bangladesh War 1971*، ص۶۔

۲۷۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۲۴۔

۲۸۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۹۹۔

۲۹۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے، ص۱۰۷۔

۳۰۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص ۸۷۔

۳۱۔ ایضاً، ص۳۲۔

۳۲۔ طارق اسماعیل ساگر، حمودالرحمٰن کمیشن رپورٹ آخری سگنل کی کہانی، (لاہور: ساگر پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء) ص۱۲۷۔

۳۳۔ صدیق سالک، سیلوٹ، ص۱۴۱۔

۳۴۔ امیر عبداللہ خان نیازی، لیفٹیننٹ جنرل، میں نے ہتھیار کیوں ڈالے، ص۲۸۔۲۹۔

۳۵۔ محمد اشفاق خان، حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ، ص۴۲۶۔۴۲۷۔

۳۶۔ ایضاً، ص۱۱۶۶۔۱۱۶۷۔

۳۷۔ ایضاً، ص۱۱۶۸۔

۳۸۔ عبدالرؤف، راقمہ سے براہ راست انٹرویو، (بہاری کالونی راولپنڈی: ۸ اگست ۲۰۱۹ء)، دوپہر ۱۲:۳۵۔

۳۹۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے، ص۷۷۔

۴۰۔ سرمیلا بوس، ڈھاکہ کہانی کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی (*Dead Reckoning Memories of the Bangladesh War 1971*، ص۱۰۲۔

۴۱۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۳۳۔

۴۲۔ ایضاً، ص۲۲۔

۴۳۔ سرمیلا بوس، ڈھاکہ کہانی کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی (*Dead Reckoning Memories of the Bangladesh War 1971*)، ص۲۶۔

۴۴۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۳۵۔

۴۵۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۶۴۔

۴۶۔ ایضاً، ص۷۶۔

۴۷۔ ایضاً، ص۱۰۶۔

۴۸۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۹۷۔

۴۹۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۸۱۔

۵۰۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۱۴۱۔

۵۱۔ ایضاً، ص۱۴۴۔

۵۲۔ صدیق سالک، سیلوٹ، ص۱۶۲۔

۵۳۔ ایضاً، ص۱۶۶۔

۵۴۔ سید مقبول حسین، کرنل، کیمپ ۳۵، ص۷۲۔

۵۵۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص۱۸۷۔

۵۶۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۵۹۔

۵۷۔ محمد اشفاق خان، حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ، ص۶۳۴۔

۵۸۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۵۱۔

۵۹۔ صدیق سالک، سیلوٹ، ص۱۵۵۔

۶۰۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۱۲۶۔

۶۱۔ سید مقبول حسین، کرنل، راقمہ سے واٹس ایپ انٹرویو، ۸جولائی ۲۰۱۹ء، دوپہر ۱۲:۱۵۔

۶۲۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے، ص۳۵۔

۶۳۔ محمد دل شیر علی انصاری، راقمہ سے براہ راست انٹرویو، 8 دسمبر 2019ء، دوپہر ۱:۱۵۔

۶۴۔ صدیق سالک، سیلوٹ، ص ۱۷۵۔

۶۵۔ حاجی نصیر الدین، راقمہ سے براہ راست انٹرویو، (بہاری کالونی راولپنڈی: ۸ دسمبر ۲۰۱۹ء)، دوپہر ۲:۰۵۔

باب چہارم:

واقعات کے بیان واسلوب کا تقابلی جائزہ

سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے مسعود مفتی اور صدیق سالک کی جن تحریروں کا جائزہ لیا گیا وہ صرف واقعات کی پیش کش اور نوعیت کے اعتبار سے ہی منفرد نہیں تھیں بلکہ اپنے بیان واسلوب کے حوالے سے بھی ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ زیر بحث دونوں شخصیات نے اپنے مخصوص اسلوب اور انداز بیان کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی تحریروں میں انفرادیت کا مظاہرہ کیا ہے۔ مسعود مفتی نے ایک بیوروکریٹ کی حیثیت سے اور صدیق سالک نے عسکری قیادت کی ترجمانی کرتے ہوئے ۱۹۷۱ء کے ان دل سوز لمحات کو قلم بند کیا جن کا بیان ایک ادیب سے زیادہ بہتر کوئی نہیں کر سکتا ہے۔ دو مختلف شعبہ ہائے جات سے تعلق رکھنے کے باوجود ان دونوں شخصیات نے ایک ہی سانحے کو دیکھا، اور اس سانحے کو اپنے اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کیا۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک نے بطور جنگی قیدی ہندوستان کی جیلوں میں دو تین سال گزارے۔ ان بیتے ایام کی داستان غم اور بنگلہ دیش کے قیام کی قیامت خیز سرگزشت کا احوال بھی ان کی تحریروں میں اپنے مخصوص اسلوب کے ساتھ ملتا ہے۔ ایک سول سرونٹ اور فوجی افسر کی تحریروں میں کہیں مشابہتیں تو کہیں انفرادیت کے خوبصورت رنگ جھلکتے ہیں۔ اپنی تمام تر فنی باریکیوں اور رعنائیوں سے مزین ان کی تحریریں آج بھی قاری کے سامنے ایک صاف اور واضح تصویر پیش کرتی ہیں۔

بیان واسلوب کے حوالے سے جائزہ لیں تو مسعود مفتی اور صدیق سالک کی تحریریں اپنی صنف کے اعتبار سے بھی اور مجموعی طور پر بھی وہ تمام فنی خوبیاں سمیٹے ہوئے ملتی ہیں جو ان کے فن پاروں کو منفرد بناتی ہیں۔ انہوں نے ڈائری، ریپوتاژ، خودنوشت، تاریخ اور دیگر اصناف نثر کو نہایت شائستہ اور شگفتہ اسلوب کو ملحوظ رکھا ہے۔ ایک منجھے ہوئے ادیب کی طرح ان دونوں شخصیات نے ہر صنف کے اعتبار سے اسلوب کا استعمال کیا مگر ان کا ایک مخصوص اور فطری انداز بیان ہر تحریر میں جھلکتا ہے۔ وہ مخصوص اسلوب اور انداز بیاں جو ہر ادیب کا خاصہ ہوتا ہے۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک کے ہاں یہ طرزِ تحریر اپنے اپنے انداز میں موجود ہے۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک کی تحریروں کی نمایاں اور مشترک خوبی ان کی تحریروں میں روانی اور تسلسل ہے۔ دونوں کے ہاں واقعات کی ترتیب اور زمانی تسلسل بھی بہت حد تک میل کھاتا ہے۔ ۱۹۷۱ء سے قبل کے واقعات سے لے کر جنگ میں ہتھیار ڈالنے اور اس کے بعد کے احتساب تک کی تاریخ اور اوقات کار میں ایک ہی تسلسل اور ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ دونوں شخصیات نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ واقعات جن تاریخوں اور وقت پر رونما ہوئے ان کو اسی ترتیب سے بتایا جائے۔ تحریر قلم بند کرتے ہوئے بھی اسی بات کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ مسعود مفتی کا انداز بیاں اس مثال میں دیکھا جا سکتا ہے:

بدھ وار، ۲۶ مئی ۱۹۷۱ء ساڑھے گیارہ بجے رات، عام سا دن، صبح دفتر، دوپہر آرام شام بارش، بیچ میں گپ شپ اور بالآخر رات کو ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں دعوت۔ صبح ہی صبح دفتر سے لاہور بشریٰ کو کال بک کی جو بعد ازاں خرابی بسیار ساڑھے بارہ بجے ملی۔[1]

درج بالا مثال میں نہایت مختصر انداز میں مسعود مفتی نے بہت سی تفصیلات کو چند جملوں میں ایک ہی تواتر سے پیش کر دیا ہے۔ خانہ جنگی کے حالات و واقعات کو اتنی جامعیت سے قلم بند کرنا ایک مشکل امر ہے، لیکن اپنی تحریروں میں ایک ترتیب سے واقعات کو پیش کرنا مسعود مفتی کا خاصہ ہے۔ مشرقی پاکستان کے حالات و واقعات پر مبنی ان کی ڈائری اور رپوتاژ ادبی معیار پر بھی پوری اترتی ہیں جو ایک بڑا تخلیقی و تاریخی سرمایہ ہے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ظہور احمد اعوان داستان تاریخ رپوتاژ نگاری میں یوں رقم طراز ہیں:

۱۹۴۷ء کے بٹوارے پر بہت سا ادب تخلیق ہوا ہے۔ مگر ۱۹۷۱ء کے سانحے پر اردو میں زیادہ تخلیقی ادب پیش نہیں ہو سکا۔ تاہم اس سلسلے میں مسعود مفتی اور صدیق سالک کی رپوتاژ میں اس المیے پر لکھی جانے والی ہزاروں رپورٹوں اور تاریخی کتابوں پر بھاری ہیں۔[2]

مسعود مفتی کی تحریروں میں سقوط ڈھاکہ سے متعلق جتنے بھی واقعات کا ذکر ملتا ہے، نہ صرف ان واقعات میں بلکہ اس سے متعلقہ ذیلی موضوعات میں بھی وہی انداز بیان اور تسلسل دیکھا جا سکتا ہے۔ واقعات اس روانی سے ایک رو میں بہتے چلے جاتے ہیں کہ قاری کے لیے ان کو سمجھنا بالکل بھی دشوار نہیں ہے۔ دوران قید اور اس سے قبل کے وہ واقعات جو تاریخی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں مسعود مفتی کے قلم سے ایک ترتیب سے پیش ہوئے، ایک جگہ بیان کرتے ہیں:

بائیس نومبر ۱۹۷۱ء سوموار عید کی چھٹیوں کا آخری دن تھا۔ رات پونے نو بجے کی خبروں میں ریڈیو پاکستان نے اعلان کیا کہ ہندوستان نے باقاعدہ اعلان کیے بغیر مشرقی پاکستان پر بارہ ڈویژن فوج سے پانچ محاذوں پر حملہ کر دیا۔[3]

اسی طرح صدیق سالک کی سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے لکھی گئی غیر افسانوی تصانیف بھی نہایت ترتیب اور تسلسل سے واقعات کو لے کر چلتی ہیں۔ وہ تحریر خواہ سیلوٹ (خود نوشت) ہو، ہمہ یاراں دوزخ (رپوتاژ) یا میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا (تاریخ) جیسی تاریخی و ادبی حیثیت رکھنے والی تحریر ہو، کہیں بھی ترتیب اور تسلسل میں بے ربطی کا احساس نہیں ہوتا۔ صدیق سالک کی زیر بحث تینوں تصانیف ابواب کی صورت میں تقسیم کی گئی ہیں جن سے سیاسی و جنگی صورتحال کو سمجھنا آسان ہے۔ یہ ترتیب صرف فہرستِ ابواب تک محدود نہیں

ہے بلکہ پوری کتاب اول تا آخر اسی ترتیب پر کار بند رہتی ہے۔ ذاتی واقعات، مختلف شخصیات سے ملاقات، سیاسی پیچیدگیاں، دیگر تمام امور کو تاریخ وار ترتیب سے پیش کرتے ہیں۔ ایک جگہ پابندی وقت کی مثال کچھ اس انداز سے سامنے آئی ہے۔

> ۲۰ دسمبر کو صبح آٹھ بجے کے قریب جنرل نیازی اپنی مخصوص قیام گاہ سے نکل کر اپنے سابق ٹیک ہیڈ کوارٹرز کی طرف آئے۔[۴]

جنگی صوتحال کے دوران پیش آنے والے واقعات میں بھی وقت کی ترتیب اور واقعات کا تسلسل مد نظر رکھتے ہیں۔ واقعات خواہ عینی شاہد کی حیثیت سے پیش کیے گئے ہوں یا کسی دوسرے فرد کی زبانی ان کو پیش کیا گیا ہو ،ان کا مخصوص اندازِ تحریر ہر جگہ غالب نظر آتا ہے۔ انہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ حالات وواقعات میں تاریخی اعتبار سے ایک ترتیب کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے تاکہ قاری کے ذہن میں واقعات کا تسلسل برقرار رہے۔ عسکری کاروائیوں کے بیان میں بھی یہ تسلسل برقرار رہتا ہے۔ لکھتے ہیں:

> جنرل نیازی ۲۲ نومبر سے دو دسمبر تک تقریباً روزانہ سرحدی علاقوں کے دورے پر جاتے رہے۔ مجھے یاد ہے ۲۷ نومبر کو وہ ہلی تشریف لے گئے جہاں غیر ملکی صحافیوں کی ایک جماعت بھی پہنچی ہوئی تھی۔
>
> وہیں ایک غیر رسمی اخباری کانفرنس شروع ہوگئی جو تقریباً آدھ گھنٹہ جاری رہی۔[۵]

صدیق سالک کی تحریروں میں عمومی طور سے مزاحیہ اسلوب کے نمونے نہیں ملتے ، مگر ان کی کتاب سیلوٹ میں مزاح کی بہت خوبصورت مثالیں موجود ہیں۔ ان کی دیگر تحریروں میں مزاح طنز کی آمیزش کے ساتھ ملتا ہے۔ جو قاری کو لطیف احساس تو عطا کرتا ہے مگر ایک گہری چوٹ بھی لگاتا ہے۔ صدیق سالک کا مزاحیہ انداز نہایت منفرد اور دلفریب ہے۔ سیلوٹ میں صدیق سالک جنرل نیازی سے ملاقات کے ایک واقعے کا احوال کچھ اس طرح سے پیش کرتے ہیں:

> جنرل صاحب زنانہ قسم کے سنگار میز کے سامنے بیٹھے خواتین کی آئی برو پنسل سے مصنوعی مونچھیں بنا رہے ہیں۔ ایک مونچھ بناتے ہیں تو دوسری چھوٹی رہ جاتی ہے، رومال کو تھوک لگا کر لمبی مونچھ کو چھوٹا کرتے ہیں تو وہ ضرورت سے زیادہ چھوٹی ہو جاتی ہے۔ مجھے غالب کا یہ مصرع بے اختیار یاد آیا:
>
> کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے[۶]

ایک اور جگہ دوران علاج ہسپتال کے ڈاکٹروں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

ایک پابندی وقت کے قائل مرد ڈاکٹر کے متعلق ہماری قیاس آرائی تھی کہ یہ شخص جو روزانہ ٹھیک تین بج کر ۵۴ منٹ پر آتا ہے کبھی کسی حسینہ کے ساتھ ڈیٹنگ (Dating) نہیں کر سکتا کیوں کہ جوں ہی وہ بے چاری ایک منٹ لیٹ ہوئی، اس نے Appointment کینسل کر دی، بھلا اتنی پابندی وقت کے ساتھ بھی کبھی گلشن کا کاروبار چل سکتا ہے۔[۷]

صدیق سالک کو صورت واقعہ سے مزاح پیدا کرنے کا فن آتا ہے۔ چنانچہ وہ کسی بھی قسم کی صورتحال کو پیش کرتے ہوئے طنزیہ حربوں کے ذریعے انتہائی سنجیدہ واقعات کو بھی مزاح کے پردے میں لپیٹ کر پیش کرتے ہیں۔ دوران قید صدیق سالک اور دیگر فوجی افسران مختلف طرح کی فوجی ورزشوں جن میں پی ٹی اور دیگر مشاغل شامل ہیں سے اپنے وقت کا درست استعمال کیا کرتے تھے۔ اس حوالے سے ایک روز انہوں نے جب پی ٹی کرتے افسران اور جوانوں کو دیکھا تو اپنے مزاحیہ اسلوب سے اس واقعے میں یوں جان ڈالتے ہیں :

ایک تربیت یافتہ گوریلا افسر نے انسٹرکٹر کے اختیارات سنبھالے ہوئے ہیں اور باقی سب اس کے اشارے پر کبھی جھک کر زمیں بوس ہو جاتے ہیں اور کبھی اچھل کر آسمان سے تارے نوچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پسینہ بہہ رہا ہے، خاکی پتلون بھیگ چکی ہے جبیں سے عرق مشقت کے قطرے منہ میں ٹپک رہے ہیں لیکن پی ٹی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سوچا کیسے ناشکرے ہیں! اللہ تعالیٰ نے جی بھر کر سونے اور آرام کرنے کی مہلت دی ہے اور یہ خون پسینہ ایک کر رہے ہیں۔[۸]

درج بالا مثالوں کی طرح بہت سے چھوٹے چھوٹے واقعات اور جملوں کے ذریعے مزاح پید کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جو قاری کو ایک لطیف احساس عطا کرتا ہے۔ اور تحریر میں قاری کی دلچسپی میں اضافہ کرتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مزاح کی ایک اور صورت بھی صدیق سالک کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ وہ طنز کی آمیزش کے ساتھ مزاح پیدا کرتے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے دلسوز سانحے کی رو سے دیکھیں تو صدیق سالک کا مزاحیہ انداز ایک گہرے طنز کی غمازی کرتا ہے۔ یہ طنز واقعات کے تناظر میں اپنے اندر گہری کاٹ لیے ہوئے ملتا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

بھگی سمیت شریف دال بانٹنے آیا تو اس نے دو سوکھی چپاتیاں میرے سپرد کرتے ہوئے خوشی سے کہا صاحب! مبارک ہو، سنا ہے تاشقند ہو گیا ہے۔ اب ہم لوگ ادھر جا رہے ہیں راستے کے سفر کے لیے روٹیاں ہیں۔ میں نے چپاتیاں غور سے دیکھیں تو ان پر چٹنی نما کسی سبزی کا داغ بھی تھا۔ بھارت کا مہمان بھلا روکھی روٹی کھائے گا۔[۹]

ان کا یہ انداز اور بھارتی سپاہیوں کے رویے کا بیان ہمیں اصل حقیقت کو پرکھنے میں مدد دیتا ہے۔ صدیق سالک کا مزاح کا انداز جہاں قہقہے لگانے پر مجبور کرتا ہے وہیں قاری کی آنکھوں کو اشکبار بھی کر دیتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ

جیسے المناک سانحے کی روداد جب مزاح اور غم کی آمیزش سے سامنے آتی ہے تو تحریر کو نہایت مؤثر بنا دیتی ہے۔ جنگی قیدی کی حیثیت سے اپنی حس مزاح کو برقرار رکھنا اور حالات کا درست تجزیہ کرنا صدیق سالک کو با اثر ادیبوں کی فہرست میں لا کھڑا کرتا ہے۔ دشمن کی قید میں رہتے ہوئے اپنی تحریر اور مزاج کی شگفتگی کو برقرار رکھنا بہت دقیق امر ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ مسعود مفتی کی ابتدائی تحریروں میں مزاح کا رنگ دیکھا جا سکتا ہے مگر سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے ان کی غیر افسانوی نثر مزاح سے مبرا ہے۔ مسعود مفتی نے روزنامہ جنگ، راولپنڈی کے سوال "میں کیوں لکھتا ہوں.....؟" میں جواب دیتے ہوئے کہا:

> میں نے مزاح کا سہارا لیا۔ اس لیے کہ اس میں اپنے سسٹم کا مذاق اڑا سکتا تھا لیکن کچھ عرصہ بعد میں نے محسوس کر لیا کہ اپنے خیالات کے اظہار کے لیے مزاح بہت محدود کینوس ہے۔ اس کے بعد میں نے افسانہ شروع کیا۔ لیکن ہر صنف ادب کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ اگر آپ ان کو وائیلیٹ کرتے ہیں تو وہ ادب نہیں رہتا اس لیے افسانہ لکھنے کے بعد بھی کچھ تشنگی محسوس ہوئی تو پھر میں نے ریپوتاژ کا سہارا لیا۔ یہ سب ذریعے فرد کی ذات سے وابستہ رہنے کے لیے تھے۔[10]

مسعود مفتی کے تخلیق کردہ ادب کی ایک اور خوبی ان کی تحریر میں تشبیہات اور استعارات کا خوبصورت استعمال اور منفرد انداز بیاں ہے۔ واقعات، جذبات، خیالات واحساسات کا جو تسلسل اور بیان مسعود مفتی کی تحریروں میں ملتا ہے اس کے لیے استعمال کی گئی تشبیہات، علامات اور استعارات بھی قابل دید ہیں۔ ان کے استعمال سے واقعات کی ایک واضح صورت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے فسادات کے حوالے سے خوف وہراس کی حالت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> دھماکے برات کے گولوں کی طرح تھے۔ گولیاں فضا میں پنچھی پکھیرو کی طرح اڑتی تھیں۔ خون کے چھینٹے پان کی پیک کی طرح عام تھے۔[11]

ایسے ہی فسادات کے متعلق ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

> غیر یقینی حالات کے قوی تھپڑوں سے ویسے ہی سہمے ہوئے افراد — کہیں ننگی بربریت، کہیں کھلی فرعونیت اور کہیں کہیں بادلوں میں سے جھانکنے والے چاند کی طرح ڈھکی چھپی انسانیت — ڈھاکہ کے گلی کوچے، سڑکیں اور مکان پہلے جیسے ہی تھے۔ مگر مکین بدل گئے تھے۔[12]

غیر روایتی علامتوں اور تشبیہات کا استعمال مسعود مفتی کی تحریروں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ جنگی کشیدگی، سیاسی حالات، ذاتی تجربات اور جائزہ، ان تمام کا مجموعہ ایک منفرد اندازِ بیان کا حامل ہے۔ جنگ سے قبل کے حالات،

دورانِ جنگ اور بعد کے حالات ان تینوں مراحل کو موقع کی مناسبت سے الفاظ کے سانچے میں ڈھالتے ہیں۔ یوں ہر واقعہ اپنا ایک واضح تصور پیش کرتا ہے۔ ملک ٹوٹنے کے بعد اس کی اجڑی ویران حالت زار کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی۔ مسعود مفتی ایک جگہ پرانے ڈھاکہ کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> اداسی کے ساتھ ایک اور رنگ بھی تھا۔ بعض چہرے ایسے بھی تھے جو بظاہر سپاٹ تھے مگر ایک ڈھکی چھپی سی بے کلی لیے ہوتے تھے۔ جیسے بلی کے پاؤں کے نرم پوروں کی اوٹ میں نوکیلے ناخن کی بے اعلان چبھن۔ [۱۳]

علامتوں کا استعمال کرتے ہوئے مسعود مفتی بہت بڑے بڑے مفاہیم کو چند الفاظ میں پرو کر پیش کرتے ہیں جس سے نہ صرف مطلب واضح ہو جاتا ہے بلکہ تمام ادبی و فنی لوازمات کا استعمال تحریر کو جلا بخشتا ہے۔ وہ اپنی بات کو لمبی لمبی وضاحتوں میں بیان کرنے کی بجائے ایسا انداز اختیار کرتے ہیں جہاں جملوں کی طوالت بھی نہیں ہوتی اور نادر علامات گفتگو کا مفہوم بھی سمجھا دیتی ہیں۔ یوں نتیجتاً ایک ایسی تحریر پڑھنے کو ملتی ہے جو مختصراً اپنا مفہوم واضح کر دیتی ہے۔ اسی خوبی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مسعود مفتی لکھتے ہیں:

> یہ لوگ کچھ عجیب سے انداز لئے گھوم رہے ہیں۔ خدائی کا انداز، بے پرواہی کا انداز، ہرجائی کا انداز، گل چیں و گل فروش کا انداز، پتلوں کا تماشہ دکھانے والے کا اعتماد، میر محفل کا سا دبدبہ، برتری کا نمایاں احساس، حقارت کا دبا دبا اظہار۔ [۱۴]

مشرقی پاکستان کے قیام کے دوران انہوں نے بہ نظر غائر ان تمام اسباب و عوامل کا مشاہدہ کیا جو ملک کی تقسیم کا سبب بنے تھے۔ ان تمام واقعات کا بیان مختصراً مگر بہت مربوط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ درج بالا مثالیں مسعود مفتی کی ادبی و فنی بصیرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ مسعود مفتی کی طرح صدیق سالک کی تحریروں میں بھی زبان و بیاں کی خوبیاں ملتی ہیں۔ انہوں نے اصناف نثر کو مد نظر رکھتے ہوئے اسلوب اختیار کیا۔ جہاں سیلوٹ کی زبان عام اور سادہ ہے وہیں ہمہ یاراں دوزخ اورمیں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا میں مشکل الفاظ، تشبیہات اور استعارات کے استعمال سے واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ عام طور پر غم کا اظہار سادہ الفاظ میں کیا جاتا ہے مگر صدیق سالک کے ہاں غم کی روداد مشکل پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ غیر روایتی تشبیہات کا استعمال کرتے ہوئے بنگالی دکانداروں کے معنی خیز رویے کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں:

> وہ نہ تو کھل کر مخالفت کرتے تھے اور نہ دکانداروں کی طرح بیٹھے بن کر دکانداری کرتے تھے ان کی

حالت مجھے اس بے بس عورت کی طرح لگی، جس کا نکاح اس سے پوچھے بغیر ایک ایسے شخص سے کر دیا گیا تھا جس سے طلاق لینے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا تھا۔[۱۵]

سقوط ڈھاکہ پر جب ہر آنکھ اشک بار تھی ہر دل غم کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا تو ایسے میں صدیق سالک جیسے ادیب کے قلم سے ان حالات کی داستانِ غم بیان نہ ہوتی یہ ممکن نہ تھا۔ صدیق سالک لوگوں کے جذبات اور احساسات کو تشبیہات و علامات کی زبان دے کر اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ گویا مکمل ماحول کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ جہاں ان کے الفاظ نہ صرف ان کی اپنی کیفیت کی عکاسی کر رہے ہوتے ہیں بلکہ ان کے ساتھیوں کی بھی حالتِ زار بہت واضح انداز میں بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح کی کیفیت کو پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس ماتمی ماحول سے فرار کی خاطر میں نے بشیر، کیانی اور غلام رسول کو ڈھونڈا کہ شاید وہی عزم و ہمت کی شمع جلائیں لیکن آج وہاں بھی رواں مژگانِ چشم تر سے خون ناب تھا۔ آنسو تسبیح کے دانوں کی طرح گر رہے تھے۔[۱۶]

صدیق سالک کے ریپوتاژ اور تاریخ میں مشکل تشبیہات و علامات کی مدد سے حالات و واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ مگر یہ علامتیں اور فنی لوازمات قاری کی طبیعت پر گراں نہیں گزرتے ہیں۔ موسم برشگال، نانِ ضویں، بقدر دودِ چراغ کشتہ، ناشنیدہ، موشے دایان، سنگ دشنام، لحیم و شحیم اور ایسے بہت سے مشکل الفاظ صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر میں بطور تشبیہات و علامات موجود ہیں۔ یہ ادبی خوبیاں ان کی غیر افسانوی نثر کو بھی ایک ادبی رنگ و آہنگ عطا کرتی ہیں۔ ایک جگہ سقوط سے بے گھر ہونے والے افراد کا حال کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ:

خیمہ افلاک کے سوا ان کے سر پر کسی شے کا سایہ نہ تھا وہ ذلت آشیاں بندی کے بھی اہل نہ تھے۔ وہ کہر کی چادر اوڑھے شبنم آلود گھاس پر ٹھٹھر رہے تھے۔ شند ایک نے گھاس پھوس اکٹھی کر کے الاؤ سا جلا رکھا تھا جہاں سے آگ کم اور دھوں زیادہ اٹھتا تھا۔[۱۷]

بیان و اسلوب میں طنزیہ تحریریں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں۔ مصنف جو بات عام الفاظ میں نہیں کہہ سکتا اسے طنز کی کاٹ میں پرو کر پیش کرتا ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے مسعود مفتی کی تحریروں میں کہیں کہیں یہ طنزیہ اندازِ بیاں بھی ملتا ہے۔ حقیقت اور صداقت پر مبنی تصویر جب بھی پیش کی گئی مسعود مفتی نے کسی حد تک طنز کا سہارا لے کر تاریخ پر سوالیہ نشان لگایا۔ یہ سوالیہ اندازِ بیان نہ صرف اس وقت کے لوگوں کے لئے تھا بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی احتساب کی طرف مائل کرنے کے لئے ہے۔ اردو ادب میں ان کی تحریریں سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے آج بھی ایک منفرد مقام کی حامل ہیں۔ اپنی قوم کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

دراصل ہماری قوم تاثرات کی ٹانگوں پر چلتی ہے اور نعروں کے شور پر اچھلتی ہے۔ ٹھنڈے دماغ سے کوائف اکھٹے کر کے ان سے منطقی نتائج اکھٹے نہیں کرتی اسی وجہ سے کبھی خرد کو جنوں کہ اٹھتی ہے اور کبھی جنوں کو خرد بنا جاتی ہے۔[۱۸]

بعض اوقات مسعود مفتی کا طنزیہ لہجہ نہ صرف ان کے جذبات کی مکمل عکاسی کر جاتا ہے بلکہ اہل فکر و اہل نظر کو سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ ہمارے کن جرائم کی پاداش میں ملک تقسیم ہو گیا۔ ان کا احتسابی انداز جب طنز کے تیر برساتا ہے تو ایک عام ذہن کو بھی سوچ کی عمیق گہرائیوں میں چھوڑ کر چلا جاتا ہے تاکہ وہ اپنا جواب تلاش کر سکیں ۔ دوران قید وہ جس ذہنی کرب سے گزرے اور زندگی کا وہ دور انہیں جو کچھ سکھا کر گیا اس کا اظہار ان کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ ایک قیدی جس تکلیف کا سامنا کرتا ہے اور اس کی نفسیات جس طرح سے متاثر ہوتی ہے اس کی ایک جھلک اس تحریر میں دیکھی جا سکتی ہے جب مسعود مفتی ایک قیدی کی نفسیات کو اس طرح سے بیان کرتے ہیں:

قیدی یہ سمجھتا ہے کہ خدا دشمن کا ساتھ دے رہا ہے۔ دشمن یہ سمجھتا ہے کہ وہ خود خدا ہے۔۔۔ اور خدا؟ نہ معلوم چپکے سے کدھر چلا جاتا ہے۔ ظلم دیکھتا ہے نہ فریاد سنتا ہے، نہ دعا وصول کرتا ہے۔ شاید خدا کا یہی انداز جہنم کہلاتا ہے۔ کیوں کہ خدا کے اس انداز تغافل سے ایک آگ سی بھڑک اٹھی ہے۔ قیدی کے گھٹے ہوئے سینے کے اندر اور پھٹتے ہوئے دماغ کے اندر، جس کے شعلے کسی کو بھی نظر نہیں آتے۔[۱۹]

مسعود مفتی محض قیدی کی نفسیات کے بیان سے ہی طنز پیش نہیں کرتے بلکہ اس کی خفیف سی جھلک ان کرداروں کے متعلق بھی دیکھی جا سکتی ہے جو اتنے سارے لوگوں کو قیدی بنانے کے ذمہ دار تھے۔ وہ ان کرداروں کو فراموش نہیں کر سکتے ہیں جو ملکی سالمیت کو داؤ پر لگا گئے۔ جن کے لگائے زخم نہ جانے کبھی بھر سکیں گے یا نہیں۔ قوم ان زخموں کے نشان مٹائے گی یا نہیں۔ یہ وہ نشاں تھے جو ہر لحظہ ملک ٹوٹنے کی یاد دلاتے ہیں اور دھرتی کا اتنی آسانی سے کب بھلایا جا سکتا ہے۔ انہی مرکزی کرداروں میں ایک کردار یحییٰ خان کا تھا۔ فیض کے ایک مصرعے کو لے کر یحییٰ خان کے متعلق کچھ اس انداز میں طنز کرتے ہیں:

خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

مگر فضا میں ہر چہار سو یہ سوال معلق تھا۔ لیکن یہ دھبے کیسے دھلتے۔۔۔ خون تو پانی سے دھلتا ہے۔ مزید خون سے نہیں دھلتا۔ یہ چھوٹا سا نکتہ جنرل یحییٰ سمجھنے یا ماننے کو تیار نہ تھے۔[۲۰]

مسعود مفتی کی نسبت صدیق سالک کی تحریروں میں طنز کی کاٹ گہری اور شدید محسوس ہوتی ہے۔ ان کے الفاظ مسعود مفتی کی نسبت زیادہ نخوت کا اظہار کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ بھارتی حکام کے رویوں سے لے کر ان کے اردلی تک کے انداز پر طنز ملتا ہے۔ اس سے ان کی بھارتی حکام کے رویوں سے نفرت کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں وہ کسی بغض سے کام لئے بغیر بنا کسی لگی لپٹی کے حالات کو بالکل واضح انداز میں پیش کرتے ہیں۔ مگر بحیثیت ادیب وہ قاری کو ایک تاریخی وادبی سرمایہ مہیا کرتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد قیدیوں کے لیے ناکافی طبی سہولیات کے متعلق کچھ اس انداز سے طنز کرتے ہیں:

> ایسی طبی مراعات ہم نے کہیں دیکھی تھیں نہ سنی تھیں، لیکن اس کے باوجود ساری دنیا میں ان طبی سہولتوں کا ڈھنڈورا پیٹا جارہا تھا۔ یہ طرفہ تماشا دیکھ کر تسلیم کرنا پڑا کہ بھارت عظیم ہے کیوں کہ ہینگ اور پھٹکڑی لگائے بغیر چوکھا رنگ لانے کے گر جانتا ہے۔ [۲۱]

دوران قید صدیق سالک نے بھارتی حکام کے رویوں ان کی حرکات کا بغور جائزہ لیا۔ قید میں اکثر اوقات ان کی بیرکوں کی تلاشی لی جاتی اور اس دوران بھارتی سپاہی نہایت احمقانہ انداز میں تلاشی لیتے۔ کہنے کو وہ بہت ذمہ دارانہ انداز میں پاکستانی سپاہیوں کی ہر شے کنگھالتے مگر اپنی ناقص تربیت کی بنا پر وہ کافی مضحکہ خیز طریقے اختیار کئے ہوئے تھے۔ ادیب کا قلم یہاں بھی خاموش نہیں رہا۔ صدیق سالک تلاشی لینے والے سپاہوں کی حرکات کو طنزیہ الفاظ میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ان "دانشمندانہ" احکام کا احمقانہ پہلو یہ تھا کہ پلیٹیں اور چمچ تو جمع ہو جاتے، لیکن سبزی کاٹنے کی چھری اور لکڑیاں پھاڑنے کی کلہاڑی ہمارے پاس رہتی دھاگے اور تسمے خطرے کی علامت سمجھے جاتے لیکن چارپائیوں کی سینکڑوں گز ادوائن پر ہرگز توجہ نہ دی جاتی۔ بھارت عظیم ہے اور اس کے اندز عظیم تر مجھ جیسے کم عقل کو اس حکمت عملی کا فلسفہ قطعاً سمجھ میں نہ آیا۔ [۲۲]

صدیق سالک نے بھی متنازعہ کرداروں کو لے کر وضاحت دیتے ہوئے طنز کی کاٹ استعمال کی ہے۔ سقوط کے معروف کرداروں کی پھیلائی گئی وبا کے متاثرین میں خود مصنف بھی شامل تھے۔ یہ وہ وبا تھی جو اک عرصے سے ملک کو لاحق تھی۔ جس کو روکنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ افواجِ پاکستان کا حصہ ہونے کی بنیاد پر عسکری کرداروں کا واضح اور بے لاگ تجزیہ صدیق سالک کی تحریروں کا حصہ رہا۔ ایسے میں یحییٰ خان جیسا مرکزی کردار ان کے قلم کی زد سے کیسے بچ سکتا تھا۔ یحییٰ خان کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

مشرقی پاکستان میں شورش برپا رہی اور یحییٰ خان راولپنڈی میں بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا وہ ۲۵ مارچ کی فوجی کاروائی کا حکم دے کر طویل ذہنی رخصت پر چلے گئے ہیں۔ [۲۳]

بعض اوقات ان کے طنزیہ جملوں میں ایک احساس زیاں محسوس ہوتا ہے اور یہ ملک کو کھو دینے کا احساس تھا۔ ایک ادیب تاریخ کے اتنے بڑے سانحے پر کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ ادیب کے قلم کی زد میں سیاسی، عسکری عوامی ہر طرح کی شخصیات آئیں، ایسٹرن کمانڈر جنرل امیر عبداللہ خان نیازی کی اپنی ذات پر حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کو سامنے رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

اگر بھارت نے فضائیہ، ٹینک اور توپخانے سے بھرپور جنگ شروع کر دی ہوتی تو جنرل نیازی تین پلیٹ چکن تکوں کے بعد اخبار نویسوں سے چٹکلے بازی کرنے کی بجائے کسی تہہ خانے میں بیٹھ کر رو رہے ہوتے۔ [۲۴]

بہترین منظر نگاری کسی بھی ادیب کی نمایاں خصوصیت تسلیم کی جاتی ہے مسعود مفتی کی تحریروں میں جہاں تاریخی واقعات کی تلخی اور سفاکی کو بیان کیا گیا ہے وہاں بعض مقامات پر خوبصورت منظر نگاری قاری کو اپنے سحر میں جکڑ لیتی ہے۔ واقعات اور مناظر کی مکمل منظر کشی ان کے تخیل کی بلند پروازی اور الفاظ کے بہترین ذخیرے کو ظاہر کرتی ہے۔ غیر افسانوی نثر میں خوبصورت الفاظ کا استعمال جان ڈال دیتا ہے۔ اس سے حقائق کے ساتھ ساتھ ایک اچھی نثر بھی پڑھنے کو میسر آتی ہے۔ اپنی ڈائری لمحے کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

کھڑکی کے اوپر والا ایک چوتھائی حصہ نیلے آسمان سے ڈھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جس کی نیلاہٹ سہ پہر کی دھوپ میں اڑے ہوئے غازے کی مانند لگتی ہے۔ باقی حصہ دھند سے آلودہ ہے۔ کہیں کہیں سفید بادلوں کے مرغولے دھنیئے کے ارد گرد اڑنے والی روئی کے گالوں کی طرح معلق ہیں۔ [۲۵]

مسعود مفتی کی منظر نگاری ایک منجھے ہوئے ادیب کی منظر نگاری ہے جو قاری کے سامنے اس ساری صورتحال کا نقشہ پیش کرتی ہے جسے وہ قاری کو دکھانا چاہتے ہیں۔ ایک کامیاب ادیب کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ منظر اس انداز سے پیش کرے کہ قاری کا تخیل اسے اپنی آنکھوں کے سامنے پائے۔ الفاظ کا درست جوڑ تحریر کو ایک ایسے ربط میں پرو دے کہ منظر مجسم نظر آئے۔ یہ خصوصیت مسعود مفتی کی تحریر کا خاصہ ہے۔ جہاں وہ منظر نگاری کرتے ہوئے الفاظ کی مدد سے اپنے قاری کو اس منظر میں لے جاتے ہیں جو کبھی ان کے قلم سے صفحے پر اترا تھا۔ ایک اور جگہ کچھ اس انداز میں لکھتے ہیں:

شام کے سات بجے ہیں بارش ابھی تھمی ہے ۔ درختوں کے خاکے ہر لحظہ گاڑھے ہوتے اندھیرے میں گم ہوتے جارہے ہیں۔ ہوا میں خنکی ہے اور ریسٹ ہاؤس کے سامنے بہنے والا دریائے برہم پتر خاموشی سے رینگ رہا ہے۔[۲۶]

مسعود مفتی کی منظر نگاری ان تمام واقعات کو بھی سمیٹے ہوئے ملتی ہے جن کے رونما ہونے نے ملکی تاریخ بدل ڈالی۔ وہ جس قدر خوبصورتی سے مناظر قدرت کو پیش کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ حقیقت پسندی سے انسان کی تباہ کاریوں کے مناظر پیش کرتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا کہ جس کا بیان کوئی خاطر خواہ اثرات نہ چھوڑتا۔ یہ وہ سانحہ تھا کہ اتنے برس بعد بھی اس کا ذکر سب زخم ہرے کر دیتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسانوں کی تباہ کاریوں نے ہمیشہ ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ان نقوش کی جھلک مسعود مفتی کی تحریروں میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ انہوں نے جنگ کی تباہ کاریوں کے جو مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ان کو اس انداز سے پیش کیا:

انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کی سب سے اوپر والی منزل کے کمرہ نمبر ۱۱۰۸ کی کھڑکی سے جھانکتا ہوں تو ڈھاکہ شہر کی سڑکیں، بلند وبالا عمارتیں اور سبز گوشے سنسان پڑے ہیں۔ اس سے پرے ڈھاکہ امپرووومنٹ ٹرسٹ کی بلڈنگ کا گھڑی بردار مینار مریض کی سکتہ زدہ ماں کی طرح ویران آنکھوں سے گھڑیاں گن رہا ہے۔ ایک طرف یونیورسٹی کی کئی منزلہ عمارتیں اپنی بلند وبالا ذات میں گم ہیں۔[۲۷]

سقوط ڈھاکہ نے شہروں کو جس طرح ویران کیا تھا اس کی منظر نگاری اس سے بہتر ممکن نہیں تھی۔ وہ نہ صرف آس پاس کے ماحول کی درست انداز میں منظر نگاری کرتے ہیں بلکہ لوگوں کی مضطرب حالت زار کو بھی اسی خوبی سے منظر کا حصہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ جہاں حالات اس قدر دگرگوں ہوں وہاں انسانوں کا متاثر ہونا ایک فطری عمل ہے۔ خانہ جنگی تو ہر شے کو متاثر کرتی ہے پھر اشرف المخلوق اس سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتی تھی۔ جہاں ادیب کی نگاہیں منظر کو محفوظ کر رہی تھیں وہیں انسان نما لاشے بھی اپنی شناخت ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور ادیب کے قلم کا حصہ بنتے جارہے تھے۔ مسعود مفتی اس وقت لوگوں کی حالتِ زار کا بخوبی جائزہ لے رہے تھے۔ اس حوالے سے ایک مثال کچھ اس طرح ہے۔ لکھتے ہیں:

ہوٹل میں مضطرب سی خاموشی ہے۔ بوجھل، بے چین اور تکلیف دہ خاموشی۔ ایسی خاموشی جو اکا دکا باتوں کے باوجود نہیں ٹوٹتی۔ بلکہ اور گہری ہو جاتی ہے۔ باتیں بھی دھیمی ہیں اور مختصر۔ جن میں کہنے والا کچھ کہہ جاتا ہے مگر سننے والا نہیں سنتا۔ وہ اپنے گہرے خیالات میں ڈوبا ہے اور جانتا ہے کہ کہنے والے نے بھی اپنے اصل خیالات سے بچنے کے لیے اوپری بات کی تھی۔[۲۸]

یہ وہ احساسات تھے جن کو اس وقت بہت مظبوط اعصاب کا حامل انسان ہی بیان کر سکتا تھا۔ملک کے دولخت ہونے کے جو مناظر اور واقعات مسعود مفتی نے قلم بند کیے قریباً اسی کرب کے ساتھ صدیق سالک نے بھی ان مناظر کو احساسات کا رنگ دے کر پیش کیا۔ وہ منظر نگاری کے ساتھ ان جذبات کو بھی پیش کرتے ہیں جو اس منظر کو مزید واضح صورت میں قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں ۔ایک فوجی افسر کی حیثیت اچانک جنگی قیدی میں بدلی تھی ۔اس نئی شناخت نے ذات کو جس شکست وریخت کے مراحل سے گزارا تھا وہ بہت دردناک تھے۔ صدیق سالک کی تحریروں میں وہ کرب دیکھا جا سکتا ہے کہتے ہیں:

> شام ڈھلے چھاؤنی میں پہلی بار برقی قمقمے جلے ، سوچا کہ اس روشنی سے تو وہ تاریکی اچھی تھی جس کے پردے میں آزادی کا بھرم پوشیدہ تھا۔[۲۹]

صدیق سالک نے دوران قید کچھ عرصہ سیل میں بھی گزارا تھا۔اس قید نے زندگی کا وہ رخ دکھایا تھا جس سے آج تک واقفیت نہ تھی۔ بے بسی اور لاچاری کی جو کیفیت اس سیل میں محسوس کی اس کو بھی مشکل الفاظ کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ یہ وہ لمحات تھے جن کو ایک آزاد فوجی کی زندگی کے بدترین ایام کہا جائے تو بے جانہ ہو گا۔ضبط اپنی آخری حدوں کو چھو رہا تھا۔ وطنِ عزیز کے ازلی دشمن کا وار بہت کارگر ثابت ہوا تھا۔اتنا کارگر کہ ذات کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ان کی بیان کردہ منظر نگاری اس ماحول کی مکمل عکاسی کرتی ہے لکھتے ہیں:

> گردش ارضی نے بالآخر عروس شب کو الوداع کہا اور سپیدہ سحر تمازت آفتاب سے کافور ہونے لگا۔ لیکن طلوع آفتاب کے باوجود میری شب تار کی سحر نہ ہوئی میرے لیے ہوا اور روشنی پر وہی قدغن رہی جو رات بھر سے تھی۔ میں لاچار و بے بس سیل میں بیٹھا اپنے ہی خیالات کے بوجھ تلے پستا رہا اور ہر لمحے خونِ دل رستا رہا۔[۳۰]

ان خیالات کا بوجھ لئے قید کاٹنا ایک دوہرا عذاب تھا۔ایک محب وطن پاکستانی کی حیثیت سے وہ کبھی نہیں چاہتے تھے کہ ملک تقسیم ہو۔اس درد اور کرب کا اندازہ صدیق سالک کی تحریروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ایک ادیب کی سی جذبائیت اور ایک مؤرخ کا حقائق کو بیان کرنے کا انداز مجموعی صورت میں ان کی تحریروں میں جھلکتا ہے۔ جہاں حقائق زیادہ واضح انداز میں بیان کیے گئے ہیں اور جذباتی منظر نگاری موقع کی مناسبت سے موجود ہے۔ فنی و ادبی خوبیاں اپنی جگہ مسلم ہیں اور حقائق پر کسی صورت اثر انداز ہوتی محسوس نہیں ہوتی ہیں۔ آپریشن سرچ لائیٹ کی رات کا منظر کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

ٹھنڈی چاندنی میں ڈوبا ہوا شہر سو رہا تھا اور موسم بہار کی خنک ہوا میرے گالوں کو چھو کر گزر رہی تھی
۔ باہر جتنا سکون تھا میرے اندر اتنا ہی زیادہ تلاطم تھا۔ میں سوچنے لگا یہ خوشگوار رات خون کی ہولی
کھیلنے کے لیے قطعاً نامناسب ہے۔ [۳۱]

غیر افسانوی ادب میں شاعرانہ نثر، محاورات، اشعار اور مصرعوں کے ذریعے سے حالات وواقعات کو پیش کرنا مسعود مفتی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ جس نے ان کی تحریر کو رنگارنگی اور تنوع عطا کیا ہے۔ ایک بیورو کریٹ کی شخصیت میں در حقیقت کتنا شاعرانہ مزاج پوشیدہ ہے اس کا اندازہ مسعود مفتی کی تحریروں کو پڑھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ ڈائری ہو یا رپوتاژ وہ ہر صنف ادب سے انصاف کرتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ جیسے المیے کی عکاسی نثر کے ساتھ ساتھ شاعری کے ذریعے بھی کرتے ہیں۔ انسانی نفسیات نثر کی نسبت شاعری سے زیادہ جلد متاثر ہوتی ہے۔ مسعود مفتی ایک نبض شناس ادیب کی حیثیت سے تحریر کو متاثر کن بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بات مسلمانوں کے زوال کی ہو، سقوط ڈھاکہ کی یا قید و بند کی صعوبتوں کی ان کا انداز بیاں حالات وواقعات کی مکمل عکاسی کرتا ہے۔ مسلمان قوم کی اسلامی اصول وروایات سے روگردانی پر اپنے ملال کا اظہار اس شعر سے کرتے ہیں:

جن کا دین پیروی کذب وریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے ،جرات تحقیق ملے [۳۲]

اپنے احساسات کو شاعری میں ڈھال کر بیان کرنا ایک ایسا متاثر کن انداز ہے کہ اس کے لئے لمبی وضاحتوں کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ مسعود مفتی نے ہر احساس کو قلم بند کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس میں کہیں حال کی تباہ کاریاں شامل بحث ہو جاتیں تو کہیں ماضی کی حسین یادیں اپنے ہونے کا احساس دلاتیں۔ ڈھاکہ جو کبھی اپنے پورے جوبن پر تھا اجڑنے کے بعد بھی یاد آتا تھا۔ ڈھاکہ کے عروج کے زمانے کو یاد کرتے ہوئے ایک مصرعہ تحریر کرتے ہیں:

یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا [۳۳]

اپنی کتاب ہم نفس میں بھولے کے ساتھ مل کر جب ملک کے ٹوٹنے کا دکھ بانٹتے ہیں تو الفاظ کو ایک بار پھر مصرعے کا لبادہ اُوڑھا دیتے ہیں۔ ان کا کرب اس ایک مصرعے میں صدیوں کا دکھ سموئے ملتا ہے۔ وہ دکھ جو ملک کی سلامتی نگل گیا۔ جو ہم سے ہمارا بھائی جدا کر گیا۔ جو بچھڑا تو اس انداز میں کہ پیچھے ملال اور آہیں رہ گئیں۔ اسی دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں:

آ عندلیب مل کر کریں آہ وزاریاں [۳۴]

یہ آہ و زاریاں اب ہمارے حصے میں لکھ دی گئی تھیں۔ جن کو بہر طور ہمیں برداشت کرنا تھا۔ کبھی اندر خانے دکھ کی صورت میں تو کبھی بیرونی عناصر کی اذیتوں کی صورت میں۔ یہ بیرونی عناصر دشمن کی قید کی صورت میں ان پر مسلط تھے۔ بھارتی قید و بند اور صعوبتوں میں گزرے لمحات ناقابل بیان اذیت کی مانند تھے۔ بھارت جیسے ریاکار دشمن کی قید میں رگوں کا خون تک منجمد ہو گیا تھا۔ اس عرصہ حیات میں گزرے لمحات نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں تک سلب کر لی تھیں۔ مسعود مفتی بیوروکریٹ تھے مگر اس پیشے کے ساتھ وابستگی کے علاوہ وہ ایک ایسے دردمند دل رکھنے والے ادیب بھی تھے جس کا دل ان حالات میں نارمل نہیں رہ سکتا تھا۔ اس قید کی اذیت کا اندازہ اس شعر سے ہوتا ہے:

بڑے چرچے سنے ہیں سختی دیوار زنداں کے
چل اے جوش جنوں، دیوار زنداں ہم بھی دیکھیں گے [۳۵]

یہ وہی قید تھی جس نے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں مفلوج کر دی تھیں۔ ازلی دشمن کی ایک دن کی قید بھی ایک صدی کے برابر ہوتی ہے یہاں تو دو سے تین برس بیت گئے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اس دورانیے نے اپنے منفی اثرات مرتب نہ کئے ہوں۔ تنہائی کا کرب ایک آسیب کی مانند چمٹ گیا تھا۔ جہاں اس نے اعصاب کو متاثر کیا تھا وہیں نفسیات کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ قید کے انسانی نفسیات پر جس طرح کے اثرات مرتب ہوتے ہیں ان میں ایک عنصر مایوسی کا بھی ہوتا ہے۔ مجموعی طور پر مسعود مفتی کی تحریروں میں مایوسی نہیں ملتی مگر ٹوٹنے کا دکھ، شکست کا احساس اور قید کی تنہائیاں جب اکٹھی ہو جاتیں تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے کہ:

قفس میں جو ٹوٹے تھے وہ پر نہ نکلے [۳۶]

سقوط ڈھاکہ کے فسادات میں ملکی سلامتی خطرے میں پڑ چکی تھی اور اس کا اظہار مکتی باہنی اور ہندوستانی فوج کئی انداز سے کرتی تھی۔ مختلف ذرائع سے جو اطلاعات ان تک پہنچتی تھیں وہ ہر گزرتے دن کے ساتھ نئی تکلیف ساتھ لے کر آتی تھیں۔ ایک ہی ملک کے باسی جب وطن کو توڑنے لگ جائیں تو تکلیف کا احساس دوگنا ہو جاتا ہے۔ ایک ادیب کا قلم ان لمحات کو شاعرانہ انداز سے وقتاً فوقتاً بیان کرتا رہا۔ شاعری جو ہمیشہ سے انسانی جذبات کی ترجمانی کا سب سے متاثر کن ذریعہ رہی ہے، اس لمحے بھی ساتھ نبھاتی رہی۔ پاکستانی پرچم کے تقدس کو پامال کیا جاتا تو محبِ وطن پاکستانیوں کو دل کی دھڑکن رکتی محسوس ہوتی۔ پرچم کے پاؤں تلے روندے جانے اور اس کے جلائے جانے کے واقعات سننے میں آئے تو اس اذیت کو بیان کرنے کے لئے اس مصرعے کا استعمال کرتے ہیں:

یہ وہ دکھ تھا جو کبھی نثر کی صورت اختیار کر لیتا تو کبھی شاعری کی زبان میں اپنے ہونے کا احساس دلاتا۔ درد کی یہ شدت حد سے گزرتی تو اک نئی زبان میں اظہار کرنا مانگتی۔ زبان کوئی بھی ہوتی دکھ سب کا ایک تھا۔ تکلیف اور کرب کے اظہار کے لیے جہاں شاعری، شاعرانہ نثر کا استعمال کیا گیا وہیں بعض مقامات پر فارسی جملوں کے ذریعے سے بھی بات کو مکمل کیا گیا۔ جنگ بندی کے حوالے سے بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> صدر کی طرف سے جنگ جاری رکھنے کے عزم کے باوجود اگلے دن جنگ بندی ہو جاتی ہے۔ جب جمہوریت نہ ہو تو لوگ ہر چیز کو "رموز ملکیت خویش خسرواں مانند" کہہ کہ خاموشی سے منظور کر لیتے ہیں۔ [۳۸]

پھر تاریخ نے وہ لمحات بھی قلم بند کیے جب بنگلہ دیش نام کی ایک آزاد ریاست دنیا کے نقشے پر ابھری۔ مگر اس آزادی کی قیمت پاکستان کے دولخت ہونے کی صورت میں ہمیں چکانا پڑی تھی۔ یہ ایک ایسی ریاست تھی جس کی بنیاد میں بہت سے بے گناہوں کا خون شامل تھا۔ جو اس قدر ارزاں ہو گیا تھا کہ ڈھاکہ کی گلیوں میں جگہ جگہ ملتا تھا۔ مسعود مفتی بھی اس سانحے سے اتنے ہی رنجیدہ تھے جتنا کوئی بھی محب وطن پاکستانی ہو سکتا ہے۔ یہ وہ کرب تھا جس کا اظہار انہوں نے ہر ممکن طریقے سے کیا تھا۔ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد اپنے کرب کو اس شعر میں بیان کرتے ہیں:

بہت سنبھالا وفا کا پیماں مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں [۳۹]

صدیق سالک کی زیر بحث غیر افسانوی نثر بھی شاعری، محاورات اور نادر تشبیہات سے مزین ملتی ہے۔ فارسی الفاظ اور محاورات کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ مسعود مفتی کی طرح صدیق سالک نے بھی قید و بند کی صعوبتوں کو برداشت کیا تھا۔ بھارتی سپاہیوں کے ہتک آمیز رویوں کو جھیلا تھا مگر پایہ استقلال میں لغزش نہیں آئی۔ جیل کی سلاخوں کے پیچھے بیٹھے سوچنے لگتے ہیں:

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموشی
میں بندہ مومن ہوں، نہیں دانہ اسپند [۴۰]

قید میں جہاں انسان اذیت کاٹتا ہے وہیں حسین دنوں کی یادیں بھی آپ کا عظیم اثاثہ ہوتی ہیں۔ جب خاموش قید خانہ اور بند دیواریں انسان کا سانس تنگ کرنے لگتی ہیں تو یادوں کے سہارے دل کو بہلانا قیدی کا محبوب

مشغلہ بن جاتا ہے۔ یہ مشغلہ قیدی کی تکلیف کو کم کرنے کا سبب بنتا ہے۔ صدیق سالک نے بھی قید و بند میں ہر اس حسین یاد کو پاس رکھنا چاہا جو خوشگوار دنوں کا سرمایہ تھی۔ اپنی یادوں کی گم گشتہ گلیوں میں پھرتے فیض کا یہ بند تحریر کرتے ہیں:

جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی، سنسان سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل! میرے دلدار! میرے پاس رہو! [41]

ان حسین یادوں کی کشادہ گلیوں سے نکل کر وہ ان تاریک گلیوں میں گم ہو جاتے جن کے آخری سرے پر بھارتی سپاہی کھڑے ہوتے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی بھی موقع کو کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ ان بھارتی حکام اور سپاہیوں کی چال بازی کا بھی وقتاً فوقتاً ذکر کرتے ہیں۔ صدیق سالک نے نہ صرف خانہ جنگی کی حالت میں بلکہ دوران قید بھی بھارتی افسران اور سپاہیوں کے رویوں کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ ان کے کسی بھی عمل کو ناپ تول کے بغیر من و عن تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کی عیارانہ چالوں سے واقفیت کی بنیاد پر ہی اپنی رائے قائم کرتے ہیں۔ اسی ضمن میں ایک افسر کی چالبازیوں سے متعلق لکھتے ہیں:

> ارادہ بہت نیک تھا۔ الفاظ اور لہجہ بھی میٹھا تھا۔ حیرت ہوئی کہ بھارت میں یہ نوازش، یہ کرم کیا معنی؟ بے اختیار داد دینے کو جی چاہا، لیکن خرد نے دامن تھام کر مشورہ دیا کہ ایسی بھی کیا جلدی "ذرا تیل دیکھ، تیل کی دھار دیکھ۔ [42]

بھارت کے ایسے کردار کا جائزہ انہوں نے ہر مقام پر بہت گہرائی سے لیا تھا۔ سقوط کے بعد پاکستانی سپاہیوں کو جس جس انداز میں اذیت دی جاتی وہ انسانیت کے زمرے میں کسی صورت نہیں آتی تھی۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد کے انسانی رویوں کو اپنے قلم کے ذریعے محفوظ کرتے ہوئے صدیق سالک ادبی خوبیوں سے لبریز جملوں کا استعمال کرتے ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے فوراً بعد کے مناظر کو قلم بند کرتے ہوئے میجر جنرل ناگرہ کے حوالے سے بھی محاورے کا زبردست استعمال کیا۔ لکھتے ہیں:

> سٹیج بھارتی میجر جنرل ناگرہ کے قبضے میں تھا، جو تھوتھا چنا باجے گھنا کی عمدہ مثال پیش کر رہا تھا۔ وہ جنگل ہیٹ پہنے جو من میں آتا بکتا جا رہا تھا۔ [43]

کردار نگاری افسانوی اور غیر افسانوی نثر میں گہری معنویت کی حامل ہوتی ہے۔ جہاں کردار قاری کے سامنے اصل حقائق کو پیش کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اگر یہ کردار حقیقی ہوں تو تاریخ کا تاریک رخ زیادہ واضح انداز میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مسعود مفتی کی غیر افسانوی نثر میں جو حقیقی کردار پیش ہوئے ہیں ان کرداروں کی بُنت میں انہیں زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی کیوں کہ وہ جیتے جاگتے انسانوں کے کردار ہیں۔ مسعود مفتی نے انہیں ان کی مکمل سچائی اور کردار کی خوبیوں کے ساتھ پیش کیا۔ ان کی کردار نگاری قاری اور کردار کے درمیان کسی بھی رکاوٹ کو حائل نہیں ہونے دیتی ہے۔ اپنی کتاب ہم نفس کے سب سے نمایاں حقیقی کردار "بھولا" کے ذریعے ایک ایسے سچے محب وطن پاکستانی کا کردار پیش کرتے ہیں جس کی تمام عمر وطن کی محبت اور اس کے ٹوٹنے کے غم میں گزر گئی۔ بھولے کی کردار نگاری کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> گول مٹول موٹا سا نوجوان، عام لوگوں سے بڑا سر اور بڑا چہرہ، پھولے پھولے گال جیسے خمیر آٹے کے ہوں۔ عینک کے پیچھے بار بار جھپکنے والی چھوٹی مگر تیز آنکھیں، بچوں جیسی معصوم مسکراہٹ، تقریباً ہر رد عمل میں قدرتی بے ساختگی، غصہ صرف اتنا جیسے کوئی محبوب روٹھ جائے یا بچے ابھی آپس میں لڑے ہیں اور ابھی گلے میں باہیں ڈالے گھوم رہے ہیں۔ [۴۴]

یہ وہ کردار تھا جس نے نہ صرف کتاب بلکہ مسعود مفتی کی زندگی کو بھی متاثر کیا تھا۔ بھولا مسعود مفتی کی زندگی کا وہ حقیقی کردار ہے جو مشرقی پاکستان کے حوالے سے بہت اہمیت کا حامل ہے۔ مسعود مفتی نے اس کی کردار نگاری کرتے ہوئے صرف ظاہری خدوخال کو مد نظر نہیں رکھا تھا بلکہ اس میں ان صفات کا بھی ذکر کرتے ہیں جو بھولے کی شخصیت کا خاصہ تھیں اس کی کرداری خوبیاں در اصل اس کے کردار کا درست انداز میں تعین کرتی ہیں ۔ لکھتے ہیں:

> انتہائی تیز فہم اور حافظے کے باوجود اس کا ذہن کسی قسم کے جوڑ توڑ یا سازشی منصوبہ بندی کے قابل نہ تھا۔ ہر قسم کے کھیل سے دلچسپی رکھنے کے باوجود ہماری قومی سپورٹ ـــ غیبت ـــ میں بالکل کورا تھا۔ [۴۵]

یہ بھولے کے کردار کی وہ خوبی تھی جو اسے دیگر بہت سوں سے ممتاز بناتی ہے۔ مسعود مفتی کی زیر بحث غیر افسانوی نثر میں بھولے کا کردار سب سے زیادہ حاوی نظر آتا ہے۔ دیگر کرداروں کا ذکر تو ملتا ہے مگر ان کی کردار نگاری اس تفصیل سے نہیں کی گئی جتنی بھولے کے کردار میں کی گئی۔ مگر اس کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ انہوں بھولے کے کردار کے ذریعے ہر اس معاملے پر بحث کی جو قابلِ غور تھا۔ بھولے جیسا حساس کردار بذاتِ خود ہر ملکی و

بین الاقوامی مسئلے سے واقفیت رکھتا تھا اور اس پر اپنا سود مند تجزیہ پیش کرنا لازم سمجھتا تھا۔ ایسے میں اگر صرف اس کا کردار بھی ہو تو وہ اپنے اندر ہر کردار کا جائزہ لئے ملے گا۔

اس کے برعکس صدیق سالک کی تحریروں میں ایک سے زائد کرداروں کو متشکل کیا گیا ہے۔ ان کرداروں میں سیاسی و عسکری شخصیات شامل ہیں۔ ان وہ لوگ شامل تھے جنہوں نے کسی بھی طرح سے وطنِ عزیز اور خود مصنف کو متاثر کیا تھا۔ ان میں مثبت و منفی دونوں کرداروں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل یعقوب ان کی عسکری زندگی کے ایک ایسے کردار تھے جن سے صدیق سالک کی شخصیت متاثر نظر آتی ہے۔ ان سے ملاقات کا احوال بیان کرتے ہوئے ان کی شخصیت کو اس طرح سے پیش کرتے ہیں:

> میز کے اس پار مجھے ایک سلجھا ہوا شخص نظر آیا۔ مقدور بھر سیلوٹ کیا جس کے جواب میں انہوں نے اٹھ کر مصافحہ کیا، سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا، چائے کا آرڈر دیا اور مجھ سے گفتگو کرنے لگے ۔۔۔ ہر جملے کی تراش خراش سے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کے ذہن میں کوئی منجھا ہوا صراف بیٹھا ہے جو سونے کی ڈلیاں ڈھال ڈھال کر ان کے نطق کے ذریعے لنڈھا رہا ہے۔[۴۶]

یہ جائزہ ان کی جنرل یعقوب کے حوالے سے مثبت رائے کو ظاہر کرتا ہے۔ ان کا شخصیات کو پرکھنا صرف یہیں تک محدود نہ تھا بلکہ یہ نفع بخش مشغلہ دورانِ قید بھی جاری رہا۔ صدیق سالک نے دوران قید بہت سے عسکری حکام و سپاہیوں کے ساتھ وقت گزارا۔ جہاں بہت سے لوگوں کو قریب سے دیکھنے اور جاننے کا موقع ملا۔ ان میں بہت سی شخصیات اس قدر اثر انگیز تھیں کہ صدیق سالک کے قلم نے انہیں محفوظ کر لیا۔ انہیں میں سے ایک ہر دل عزیز شخصیت اعجاز کی عکاسی نہایت خوبصورت انداز میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> نو عمر، نو آموز اور نوخیز، گورا رنگ جو ہر وقت کھلا رہتا اور شرارتی آنکھیں جو مسکراتے وقت خود بخود بند ہو جاتیں۔ سیمابی جسم، کتابی چہرہ اور شتابی چال۔ وہ سارے کیمپ میں یوں آناً فاناً پھر جاتا جیسے روشنی کی کرن تاریکی میں پھرتی ہے۔[۴۷]

اگر وہ اپنی زندگی کو مثبت انداز میں متاثر کرنے والی شخصیات کو اپنی تحریر کا حصہ بناتے ہیں تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ملک کو متاثر کرنے والی شخصیات کا جائزہ نہ لیا جاتا۔ ملک کی وہ بااثر سیاسی شخصیات جنہوں نے ملک کو نہ ختم ہونے والی اذیت سے دوچار کیا ان کے بیان کے بغیر تحریر کا مکمل ہونا ممکن نہ تھا۔ سیاسی شخصیات کی کردار نگاری کرتے ہوئے صدیق سالک نے جہاں تک ممکن ہوا سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے واقعات اور شخصیات کو پیش کرنے کی

کوشش۔ ان سیاسی شخصیات میں مجیب الرحمٰن کا کردار بہت نمایاں ہے۔ مجیب الرحمٰن کے کردار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> مجھے کئی ایسے واقعات یاد ہیں جب وہ سر عام شیر کی طرح گرجتے، مگر اندر خانے حکام کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے۔ اس دو عملی کا فائدہ یہ تھا کہ ایک طرف عوام مجیب کی طرف کھنچے آتے تھے اور دوسری طرف حکام بھی ناراض نہیں ہوتے تھے۔[۴۸]

یہ وہ تجزیہ تھا جو ایک عرصے کے مشاہدات و واقعات کا نتیجہ تھا۔ کردار نگاری کا یہ عمل یہیں مکمل نہیں ہوتا ہے۔ صدیق سالک نے جہاں دیگر جرنیلوں کے کرداروں کو اپنے تجربات کی بنا پر بیان کیا ہے وہیں صدر یحییٰ کے متعلق بھی اپنے مشاہدات قلم بند کرتے ہیں۔ صدر یحییٰ دفتری امور میں خاصے کمزور واقع ہوئے تھے۔ اس حوالے سے صدیق سالک اپنے تجربات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کی شخصی کمزوریوں کا احوال پیش کرتے ہیں کہ صدر پاکستان کا جیتا جاگتا کردار آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یوں بھی یہ کردار ہماری ملکی تاریخ میں اپنی اک شناخت رکھتا ہے افسوس کہ اس شناخت کا ذکر کرتے ہر پاکستانی کا سر شرم سے جھکنے لگتا ہے۔ اپنی تحریر میں لکھتے ہیں:

> انہیں فائلوں سے گھن آتی تھی، ان کا طرز حکمرانی یہ تھا کہ ان کے حصے کی فائلیں ان کا سٹاف پڑھتا تھا۔۔۔ اگر کوئی فائل ان کی ذاتی توجہ کی محتاج ہوتی تو ان کا پرسنل سٹاف آفیسر وہ فائل لے کر ان کے حضور پیش ہو جاتا۔۔۔۔ صدر اسلامی جمہوریہ پاکستان وہیں زبانی کلامی فیصلہ صادر فرما دیتے "وہاں دے دو" یا "مت دو" اور ان کا پی ایس او ان کے فیصلے کے مطابق فائل پر لکھ دیتا کہ صدر مملکت نے منظور یا نامنظور فرما دیا ہے۔ میں نے انہیں کبھی جم کر فائلیں پڑھتے اور نپٹاتے نہیں دیکھا۔[۴۹]

یہ ان کا وہ انداز تھا جو انہوں نے ملک کی سالمیت کو تباہ کرتے ہوئے بھی برقرار رکھا۔ ان کی یہ مستقل مزاجی ہمیں جس شکست سے دوچار کر گئی وہ ملک کے لئے آج بھی قابلِ شرم ہے۔ ان جیسے جرنیلوں کی کردار نگاری کرتے ہوئے مصنف نے کافی سچائی سے حقائق کو پیش کیا۔ ایک اور جنرل جن کی عسکری کارکردگی ناقابلِ فراموش ہے جنرل نیازی کا کردار ہے۔ صدیق سالک نے اپنی غیر افسانوی تصانیف میں جنرل نیازی کے کردار کے حوالے سے بھی مختلف پہلو بیان کیے ہیں۔ اس حقیقی کردار کی کردار نگاری کرتے ہوئے انہوں نے ان واقعات کو بھی شامل بحث کیا جن سے جنرل نیازی کی شخصیت کھل کر سامنے آتی ہے اور قاری کو ان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مگر ان کی تحریروں میں یہ کردار سب سے زیادہ تنقید کا نشانہ بنتا رہا۔ لکھتے ہیں:

ڈھاکہ شہر کے باہر وہ اکثر چھاؤنیوں کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ ان دوروں میں وہ افسروں اور سپاہیوں سے فوراً گھل مل جاتے تھے۔ کبھی ان کے ساتھ چکن تکہ کھا کر اور کبھی انہیں فحش لطیفے سنا کر، ایسے دوروں میں ان کا تکیہ کلام ہوتا تھا "شیر اہور دس کنے کا فرمارے نی!" پھر وہ دوسرے سپاہی کی طرف رخ کرتے اور اس سے بھی یہی سوال پوچھتے۔[۵۰]

حقیقت نگاری کے حوالے سے جائزہ لیں تو زیر بحث دونوں شخصیات نے اپنے اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر جہاں تک ممکن ہوا حقیقی واقعات اور مثالیں دے کر حقیقت نگاری کے پہلوؤں کو واضح کیا۔ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے بالخصوص انہوں نے ہر بات کی وضاحت مثال یا واقعات کے ذریعے سے پیش کی ہے۔ فسادات کا عالم ہو یا سیاسی کشمکش، خانہ جنگی ہو یا حالت قید مسعود مفتی اور صدیق سالک زمینی حقائق کو مد نظر رکھتے ہیں اور اسی بنیاد پر واقعات اور مثالوں کے ذریعے سے اپنی بات کی گواہی پیش کرتے ہیں۔ ان واقعات اور مثالوں میں حقیقت نگاری کا جائزہ با آسانی لیا جا سکتا ہے۔ مسعود مفتی نے ایک بیوروکریٹ کی حیثیت سے ڈھاکہ میں جو وقت بتایا، اس دورانیے میں قید و بند کی صعوبتیں ایک ادیب کی حیثیت سے پیش کیں۔ ۱۹۷۱ء کے مظالم کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> صوبائی عصبیت نے جس انداز میں ظلم کیے ہیں۔ وہ ۱۹۴۷ء کے فسادات سے کہیں آگے ہیں۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ پھاڑے گئے۔ بچوں کو ماؤں سے بد فعلی پر مجبور کیا گیا۔ ایک کیپٹن کو ایک مجمع نے صرف مکوں، گھونسوں اور تھپڑوں سے مار ڈالا۔ ایک اور آدمی کو قتل کرنے کے لیے اس کے دونوں ٹخنوں پر گولیاں ماری گئیں پھر دونوں گھٹنوں پر، پھر دونوں کندھوں پر اور اسے تڑپ تڑپ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔[۵۱]

یہ حقیقت نگاری کی ایسی مثال ہے جس سے نگاہیں چرانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر تاریخ سے نظریں چرا کر اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مسعود مفتی کی حقیقت نگاری کی مثالیں اور واقعات قاری کو خون کے آنسو رلاتی ہیں۔ ایک حساس ادیب کی حیثیت سے یہ تمام واقعات یقیناً ان کے لیے بھی بہت تکلیف کا باعث تھے اور ان کے قاری کو بھی لرزا دینے والے تھے۔ یہ وہ واقعات ہیں جن کا بیان آج کے قاری کو بھی بالکل وہی مناظر دکھاتا ہے جو خود مصنف کی آنکھ نے دیکھے تھے۔ ان کی انعام یافتہ رپوتاژ چہرے کے متعلق احمد ندیم قاسمی نے یوں تبصرہ کیا ہے:

> پاکستان کی تاریخ کا وہ نازک ترین اور المناک ترین لمحہ مسعود مفتی نے جس کرب لا محدود کے ساتھ بسر کیا، اس کی نہایت سچی اور نہایت سلیس روداد جب تک پڑھی جاتی رہی، نیشنل سنٹر کا ہال

سناٹے میں آیا رہا۔۔۔ حاضرین کی اکثریت کو رلا دیا۔ جو رو نہ سکے وہ لرزتے رہے اور سوچتے رہے کہ
تاریخ کے حامل کردار بعض اوقات ملکی آبادیوں سے کیسے کیسے قیامت خیز مذاق کر جاتے ہیں۔ [۵۲]

مسعود مفتی کی طرح صدیق سالک کی تحریریں بھی حقیقت نگاری کے واقعات اور مثالوں سے خالی نہیں ملتی ہیں۔ وہ جن واقعات کے عینی شاہد ہیں ان کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرتے ہیں اور جو واقعات دیگر لوگوں کی زبانی معلوم ہوئے ان کو حقیقت نگاری کے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ صدیق سالک نے ڈھاکہ پہنچنے کے بعد سے ہی واقعات قلم بند کرنا شروع کر دیئے تھے۔ ان کی قوت مشاہدہ نے جن باتوں کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا انہیں تحریر کرنے سے نہیں روکا۔ ڈھاکہ شہر کی گلیوں میں گھومتے پھرتے اپنے تاثرات اس طرح قلم بند کرتے ہیں:

راستے میں جہاں جہاں رکا بھک منگوں کے غول مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ میں نے محسوس کیا کہ بنگال کا عام
غریب آدمی مغربی پاکستان کے انتہائی غریب آدمی سے بھی غریب تر ہے۔ مجھے مشرقی پاکستان کی
معاشی بدحالی کے بارے میں سنی ہوئی باتوں میں وزن نظر آنے لگا۔ [۵۳]

یہ وہ پس منظر تھا جس کے بعد کے مناظر بھی دل دہلا دینے والے تھے۔ ان مناظر نے جن فسادات کو جنم دیا ان کی مثال نہیں ملتی۔ فسادات شروع ہوتے ہی ایک عام مغربی پاکستانی کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ صدیق سالک کی زیرک نگاہوں سے پوشیدہ نہیں تھا انہوں نے تمام حالات وواقعات کو حقیقی مثالیں دے کر پیش کیا۔ یہ منظر اس سے کہیں زیادہ خوفناک تھے جو اس سے پہلے دیکھے گئے تھے۔ ایک واقعے کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

مشتعل ہجوم نے ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس (مسٹر فضل الرحمٰن چودھری) کو عین اس وقت
ہلاک کر دیا جب وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ناکہ بندی ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بلوائیوں
نے مقتول کی لاش کو گھسیٹا اور مسخ کیا۔ اس بیچارے کا قصور ہجوم کی نظر میں یہ تھا کہ وہ مغربی پاکستان
کا پٹھو تھا۔ [۵۴]

تاریخ نے صرف اس ایک واقعے کو ہی محفوظ نہیں کیا بلکہ ایسے بے شمار انسانیت سوز مظالم کو رقم کیا جو اخلاقی گراوٹ کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ مصنف کی نگاہیں صرف یہی رخ نہیں دیکھ رہی تھیں بلکہ سیاسی ملاقاتوں اور کارروائیوں میں بھی صدیق سالک کی دور رس نگاہیں تمام حالات وواقعات کا مشاہدہ کر رہی تھیں۔ انہوں نے بغیر کسی لگی لپٹی کے صورتحال کو جس طرح محسوس کیا اس کو بالکل اسی انداز میں قلم بند کر دیا۔ ۷ مارچ کو یحییٰ اور مجیب کے درمیان تعطل کا شکار ہو جانے والے اجلاس کے بعد کی مجیب الرحمٰن کی حالت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

میں ان کے بائیں بازو کے پاس کھڑا ان کا چہرہ پڑھتا رہا۔ ان کا چہرہ راکھ کی طرح تھا، ہونٹ شدت جذبات سے پھڑک رہے تھے اور بدن کانپ رہا تھا۔ میں مشرقی پاکستان کے سب سے بااثر لیڈر کا یہ حال دیکھ کر گھبرا گیا۔ میں نے سوچا کہ اس دندناتے شیر کی کھال میں یہ طوفان بلاوجہ نہیں آسکتا۔ ضرور ہم کسی عظیم المیے کے دوراہے پر کھڑے ہیں۔[۵۵]

یہ حقیقت کا وہ رخ تھا جو آج بھی ماضی کے ان لمحات میں جھانکنے پر ہمیں شرمندہ کرتا ہے۔ اس حقیقت نگاری کے ساتھ جذبات نگاری بھی ہوا کا رخ متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اس سے ادیب کے اندر پوشیدہ لاوے کو باہر لایا جاسکتا ہے۔ جذبات نگاری کا عنصر بظاہر غیر افسانوی ادب میں غالب نہیں ہوتا، مگر اس کے بغیر بھی ادب مکمل نہیں ہوتا ہے۔ مسعود مفتی کی تحریروں میں یہ جذباتی عنصر بھی موجود ہے۔ انہوں نے ایک عظیم قومی سانحے کو اپنے تجربات ومشاہدات کی بنیاد پر جس انداز میں قلم بند کیا وہ لائق تحسین ہے۔ مسعود مفتی نے سقوط ڈھاکہ اور قید وبند کی صعوبتوں کو قلم بند کیا تو ان لمحات کو بھی شامل حال رکھا جنھوں نے وطن کی محبت کے دروازے ان پر کھول دیئے تھے ۔ وہ پہلے بھی ایک محب وطن پاکستانی تھے مگر اس المیے نے انھیں اس محبت کا اظہار کرنا بھی سکھا دیا تھا۔ وطن سے محبت ان کی جذبات نگاری میں یوں جھلکتی ہے:

وطن محبوبہ کی طرح ہوتا ہے کہ جب دور ہو تو زیادہ یاد آتا ہے اور انسان ہر شے میں اس کی جھلک دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔[۵۶]

یہ وہ تاریخ ساز جملے ہیں جو وطن کی محبت میں لبریز شخص کے جذبات کو ظاہر کرتے ہیں۔ وطن کا عشق انسان کو انسانیت کی اس معراج پر لے جاتا ہے جہاں اپنی ذات کہیں بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔ یہ وہ جذبہ ہے جو کبھی آنسو بن کر آنکھ سے بہتا ہے تو کبھی حسین یادوں کا میلہ سجالیتا ہے۔ دوران قید یادوں کا جو میلہ ان کے آس پاس لگتا تھا اس کو بھی جذباتی انداز میں بخوبی بیان کرتے ہیں۔ یہ یادیں ایک ہجوم کی صورت میں جب ان کے ذہن کی سکرین پر چلتی ہیں تو مسعود مفتی شاعر کے قلم سے انھیں ردھم قائم کرتے الفاظ کی صورت میں لکھنے لگتے ہیں:

یادیں!!! نہ معلوم کتنے روپ بدل کر آتی ہیں اور کس کس روزن سے آنکھ لگا کر ذات کے اندر جھانکنا شروع کر دیتی ہیں۔ کوئی گدگدانے والی، کوئی ہنسانے والی کوئی رلانے والی۔ ذات کی یادیں۔ احباب کی یادیں۔ قوم اور ملک کے حالات کی یادیں۔[۵۷]

مسعود مفتی کی جذبات نگاری ان کی تحریروں کی جان ہے۔ یہ وہ خوبی ہے کہ جس کو مل جائے تو اس کی لکھی تحریر میں خود بخود زندگی دوڑنے لگتی ہے۔ اس سے ہر لمحے کو نہایت فصاحت سے بیان کیا جاسکتا ہے۔ ان کی اس خوبی

کا اعتراف ہر سطح پر کیا گیا۔ ان کا کام اس لائق ہے کہ اپنا آپ خود منواتا ہے۔ روزنامہ نوائے وقت میں اختر امان نے ایک مضمون قومی ادب کیا ہے میں مسعود مفتی کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہمارے ادب کی قومی روایت کی سب سے روشن مثال مسعود مفتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> میرے نقطہ نظر کے مطابق قومی ادب کے اجزائے ترکیبی شعور، عصری تقاضوں کا ادراک اور جمالیاتی احساس ہیں۔ ان تینوں میں سے اگر کوئی ایک چیز بھی موجود نہ ہو گی تو اس کو ہم شاید تاریخ یا صحافت کے خانہ میں تو رکھ سکیں مگر ادب یا قومی ادب ہر گز نہیں کہہ سکیں گے۔[۵۸]

جذبات نگاری جیسا اہم عنصر صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر کا بھی اہم حصہ ہے۔ مسعود مفتی کی نسبت صدیق سالک کی تحریروں میں جذبات نگاری کے لیے شاعرانہ نثر، نادر تشبیہات اور استعارات ملتے ہیں۔ ان کی تحریر میں جذباتیت کا عنصر وطن سے ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ وہ جس انداز میں آزادی کی اہمیت کا احساس دلاتے ہیں وہ ایک قیدی ہی بہتر انداز میں بیان کر سکتا ہے۔ اس لیے صدیق سالک کے ہاں جذبات نگاری رنگا رنگ الفاظ و تراکیب سے مزین نظر آتی ہے۔ ایک محب وطن ادیب کا قلم جب صفحہ قرطاس پر رنگ بکھیرتا ہے تو اس کا انداز کچھ ایسا ہو جاتا ہے:

> اگر کسی پاکستانی لیڈر کے کسی بیان سے پاکستان دشمنی کی بو آتی تو خون کھولنے لگتا۔ جی چاہتا کہ اس ناشکرے انسان کا گریبان پکڑ کر بھرے بازار میں اسے جھنجھوڑ کر اس سے پوچھا جائے کہ ارضِ پاکستان کے فرزند! کیا تجھے آزادی کی قدر نہیں ہے؟ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اگر یہ ٹکڑا بھی ہم سے چھین گیا تو ہمیں نہ زمیں جگہ دے گی نہ آسمان۔[۵۹]

ارض پاکستان سے جذباتی وابستگی کا اظہار نہ صرف ان کی عسکری سرگرمیوں میں دلچسپی سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ اس میں دیگر تمام سرگرمیاں بھی شامل تھیں۔ ملک سے وابستہ ہر واقعہ ان کے لیے اہمیت رکھتا تھا۔ کسی بھی قسم کی صورتحال ہوتی وہ اس کو ملک سے وابستہ کر کے دیکھتے۔ سیاسی پیچیدگیاں جب بھی ملکی سالمیت کو خطرے میں ڈالتیں تو ایک قیدی کی حیثیت سے ان کا دل وطن کی یاد میں تڑپنے لگتا۔ ملک میں رونما ہونے والا ہر واقعہ ان کے لئے بہت اہمیت رکھتا تھا۔ اپنی اسی جذباتی وابستگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جب بھی قفس سے صبا بے قرار گزرتی ہم سوچ میں پڑ جاتے کہ نہ جانے چمن پر غارت گلچیں سے کیا گزری۔ اسیری میں تو مٹھی بھر چاندنی اور چلو بھر دھوپ کی بھی قدر ہوتی ہے۔ وطن کی آزادی تو بڑی

چیز ہے۔ ہماری یہ تشویش سیاسی مدوجزر تک محدود نہ تھی، بلکہ ہر وہ واقعہ ہر وہ سانحہ جو پاکستان کی بقایا وقار پر اثر انداز ہو سکتا تھا ہماری توجہ کا مرکز بن جاتا۔ [60]

پھر انہی واقعات میں ایک ایسا سانحہ رونما ہوا جو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ ملک کی غیرت بھی اسی میں ڈوب گئی۔ وطن کے باسیوں کو وہ شکست ملی جس نے ان کو ملکی و بین الاقوامی سطح پر شرمندگی کے گڑھے میں غرق کر دیا۔ یہ لمحہ ڈھاکہ کے سقوط کا تھا۔ صدیق سالک سقوط ڈھاکہ کے سانحے کو نہایت دردناک انداز میں قلم بند کرتے ہیں۔ ان کی جذباتی وابستگی کا انداز ایسا تھا وہ کسی بھی محب وطن پاکستانی کو رلا سکتا تھا۔ بحیثیت فوجی یہ ان کے لئے زیادہ تکلیف دہ تھا کہ دشمن ان کے علاقے میں دندناتے ہوئے آن موجود ہوا۔ یوں ڈھاکہ تباہی کا شکار ہو گیا۔ لکھتے ہیں:

> میجر جنرل ناگرا ایک گولی فائر کیے بغیر ڈھاکہ میں داخل ہو گیا۔۔۔ اس کے ساتھ مٹھی بھر بھارتی فوج اور ڈھیر ساری فاتحانہ نخوت تھی۔ عملاً یہ ڈھاکہ کا اختتام تھا اگرچہ اسے دفن کرنے کی رسوم ابھی باقی تھیں۔ ڈھاکہ یوں چپ چاپ سو گیا جیسے اچانک حرکت قلب بند ہو گئی ہو۔ [61]

مسعود مفتی اور صدیق سالک دونوں شخصیات نے اپنی غیر افسانوی نثر کو بہترین اسلوب کے ساتھ پیش کیا ۔ شاعرانہ نثر، اشعار، تشبیہات، علامات و استعارات اور دیگر تمام فنی خوبیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے دونوں شخصیات نے اپنے تاثرات، حالات و واقعات کو قلم بند کیا۔ کہیں مشابہت اور کہیں اندازِ بیاں کے فرق کی خوبصورتی ان کی تحریروں کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے۔ تحریر کی یہ انفرادیت ان کا اندازِ بیاں سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

مسعود مفتی اور صدیق سالک نے مکمل احتیاط کے ساتھ حالات و واقعات کو ترتیب و تسلسل سے پیش کیا ہے۔ زمانی ترتیب سے واقعات کا پیش کیا جانا ایک ایسی ادبی خوبی ہے جو تحریر میں ایک ربط پیدا کرتی ہے۔ ان دونوں شخصیات نے حتی الامکان کوشش کی سقوطِ ڈھاکہ سے قبل کے واقعات سے لے کر شکست اور پھر قید و بند کی صعوبتوں سے لے کر وطن واپسی تک واقعات کو ہر ممکن طریقے تاریخی اعتبار سے قلم بند کیا جائے۔ صدیق سالک کی تحریر کی ایک اضافی خوبی ان کا مزاحیہ انداز ہے جو مشکل سے مشکل حالات میں بھی ان کے مزاج سے جدا نہیں ہوا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ستائش ہے کہ ان کی تحریروں میں موجود مزاح الہڑپن کی بجائے ایک شگفتگی اور گہری سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔

ان دونوں شخصیات کی تحریروں میں تشبیہات و استعارات کا استعمال بھی بکثرت ملتا ہے۔ یہ تشبیہات و استعارات غیر روائتی ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپی کی بھی حامل ہیں۔ ان کی مدد سے نہ صرف ادیب کا اعلیٰ ذوق نمایاں ہوتا ہے بلکہ قاری کو سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے حالات کی سنگینی کا احساس بھی دلایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک فرق بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ صدیق سالک نے اپنی تحریروں میں مشکل الفاظ کا استعمال کرتے ہوئے واقعات کو پیش کیا ہے۔ ان کی نسبت مسعود مفتی کی تحریریں سادگی سے مزین ملتی ہیں، مگر صدیق سالک کی مشکل پسندی طبیعت پر گراں نہیں گزرتی ہے۔ تحریر کی ان فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ علامات کا استعمال بھی ان دونوں شخصیات کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ یہ علامات کبھی الفاظ تو کبھی کرداروں کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔

شاعری جو کسی بھی زبان سے کہیں زیادہ متاثر کن ہوتی ہے، مسعود مفتی اور صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر میں موجود ہے۔ جہاں بہت لمبی وضاحتیں بے معنی ثابت ہوتی ہیں وہاں ایک شعر یا مصرع بات مکمل کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ ان دونوں شخصیات نے حالات وواقعات کی مناسبت سے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے لئے نہایت متاثر کن اشعار کا استعمال کیا ہے۔ اشعار کے ساتھ ساتھ فارسی تراکیب و محارات کا بہترین استعمال بھی دونوں شخصیات کی نثر کو ادبی آہنگ عطا کرتا ہے۔

فنی محاسن میں کردار نگاری کے بغیر بھی فن پارے مکمل نہیں ہو سکتے ہیں اور اگر کردار حقیقی ہوں تو وہ اپنی شناخت کا ذریعہ خود ہوتے ہیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے اہم کرادجو سیاسی و عسکری اہمیت کے حامل ہیں ان کی تحریروں کا حصہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ کوئی بھی کردار جس نے اس سانحے کے حوالے سے ان دونوں شخصیات کی زندگیوں کو متاثر کیا ان کی نثر میں شامل ہوا ہے۔ ان کی درست کردار نگاری کرتے ہوئے مسعود مفتی اور صدیق سالک ان کی بالکل واضح شخصیت قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس میں مکمل سچائی کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ ہماری تاریخ کے اس الم ناک سانحے میں ہونے والے فسادات بھی مسعود مفتی اور صدیق سالک کی تحریروں کا حصہ ہیں۔ ان کو بیان کرنے میں دونوں ادیب حقیقت نگاری سے کام لیتے ہیں۔ اس حقیقت نگاری کے تناظر میں پڑھنے والا اس خانہ جنگی اور ظلم و بربریت کی درست تصویر دیکھ سکتا ہے جو کبھی ادیب کی آنکھ نے دیکھے تھے۔

تحریر کی ادبی خوبیوں میں جذبات نگاری درست انداز میں پایہ تکمیل کو پہنچے تو غیر افسانوی نثر میں بھی ادبی چاشنی ملتی ہے۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر اسی جذبات نگاری سے سجی ہوئی ہے۔ جہاں وطن کی محبت ہو یا آزادی کی قدر، دشمن کی قید ہو یا اپنوں کے مظالم ہر واقعہ جذبات نگاری کی عمدہ مثال پیش کرتا ہے۔ مجموعی

طور پر مسعود مفتی اور صدیق سالک کی زیر بحث غیر افسانوی نثر ادبی محاسن و فنی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ان دونوں شخصیات نے اپنے تجربات کی بنیاد پر تحریر کی دلکشی بر قرار رکھی ہے۔ سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے ان کی تصانیف ہر دور کے لئے ایک بہترین ادبی سرمایہ ہیں۔ اس سرمایے کی روشنی میں آنے والے قاری نہ صرف ملکی تاریخ کے اس کٹھن دور کا جائزہ لے سکتے ہیں بلکہ احتسابی عمل کو بر قرار رکھتے ہوئے ملک کا مستقبل بھی محفوظ بنا سکتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۱۹۔

۲۔ ظہور احمد اعوان، داستان تاریخ رپوتاژ نگاری ،(پشاور:صدر ادارہ علم و فن پاکستان، ۱۹۹۹ء)، ص۲۹۷۔

۳۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۱۰۸۔

۴۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص۳۸۔

۵۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۱۵۸۔

۶۔ صدیق سالک،سیلوٹ، ص۱۵۸۔

۷۔ ایضاً، ص۱۰۷۔

۸۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص۱۲۹۔

۹۔ ایضاً ، ص۸۲۔

۱۰۔ مسعود مفتی ، "میں کیوں لکھتا ہوں ....؟ "مشمولہ روزنامہ جنگ (راولپنڈی: ۱۸ مئی ۲۰۰۱ء)، ص۲۔

۱۱۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۱۰۷۔۱۰۸۔

۱۲۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۵۳۔

۱۳۔ ایضاً، ص۵۶۔

۱۴۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے، ص۲۵۔

۱۵۔ صدیق سالک،سیلوٹ، ص۱۲۹۔

۱۶۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص۱۷۔

۱۷۔ ایضاً، ص۳۷۔

۱۸۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۲۶۔

۱۹۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۱۴۴۔

۲۰۔ ایضاً، ص۵۱۔

۲۱۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص۱۷۸۔

۲۲۔ ایضاً، ص۲۶۶۔

۲۳۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۱۴۳۔

۲۴۔ ایضاً، ص۱۵۸۔

۲۵۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۱۳۔

۲۶۔ ایضاً، ص۶۸۔

۲۷۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے، ص۱۹۔

۲۸۔ ایضاً، ص۵۵۔

۲۹۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص۴۸۔

۳۰۔ ایضاً، ص۶۳۔

۳۱۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۱۰۲۔

۳۲۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۴۶۔

۳۳۔ ایضاً، ص۵۶۔

۳۴۔ ایضاً، ص۶۷۔

۳۵۔ ایضاً، ص۱۴۱۔

۳۶۔ ایضاً، ص۱۵۰۔

۳۷۔ مسعود مفتی، چہرے اور مہرے، ص۶۲۔

۳۸۔ ایضاً، ص۷۰۔

۳۹۔ ایضاً، ص۵۳۔

۴۰۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص۶۱۔

۴۱۔ ایضاً، ص۶۶۔

۴۲۔ ایضاً، ص۲۳۹۔

۴۳۔ ایضاً، ص۳۵۔

۴۴۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۲۵۔

۴۵۔ ایضاً، ص۲۵۔

۴۶۔ صدیق سالک، سیلوٹ، ص۱۴۳۔

۴۷۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص۲۵۴۔

۴۸۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۳۲۔

۴۹۔ صدیق سالک، سیلوٹ، ص۱۱۹۔

۵۰۔ ایضاً، ص۱۵۰۔

۵۱۔ مسعود مفتی، لمحے، ص۱۹۔

۵۲۔ مقصودہ حسین، ڈاکٹر، مسعود مفتی: شخصیت اور فن، (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء)، ص۱۲۹۔

۵۳۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۱۴۔

۵۴۔ ایضاً، ص۳۶۔

۵۵۔ ایضاً، ص۸۷۔

۵۶۔ مسعود مفتی، ہم نفس، ص۸۔

۵۷۔ ایضاً، ص۱۴۴۔

۵۸۔ مقصودہ حسین، ڈاکٹر، مسعود مفتی: شخصیت اور فن، ص۱۵۲۔

۵۹۔ صدیق سالک، ہمہ یاراں دوزخ، ص۲۰۲۔

۶۰۔ ایضاً، ص۲۰۳۔

۶۱۔ صدیق سالک، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، ص۲۵۹۔

ماحصل

سقوطِ ڈھاکہ پاکستان کی تاریخ کا ایک ایسا سانحہ ہے جس کا بیج تقسیمِ ہند کے بعد سے ہی بو دیا گیا تھا اور قریباً۲۴برس میں وہ ایک تن آور درخت بن گیا، جس کی جڑیں ہندوستان کی سازشوں اور اپنے ملک کے سازشی حکمرانوں و سیاستدانوں کی امداد سے مضبوط ہوئیں۔اس حادثے نے اپنے پیچھے ایسے اثرات چھوڑے کہ کوئی بھی شعبہ زندگی اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکا۔ایسے میں ادب کا اس الم ناک سانحے سے اثر لینا ایک لازمی امر ہے۔سقوط کے بعد افسانوی و غیر افسانوی ادب میں۱۹۷۱ء کے واقعات کو موضوع بنایا گیا۔اہلِ قلم نے اس تاریخی سانحے کو اپنی تحریروں میں سمیٹا۔ بہت سی ایسی شخصیات کے نام بھی ملتے ہیں جوادیب ہونے کے ساتھ ساتھ اس سانحے کے عینی شاہد کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ جنہوں نے خانہ جنگی کے وہ مظالم دیکھے جو ان کی تحریروں میں ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو گئے۔ ان میں مسعود مفتی اور صدیق سالک کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔۱۹۷۱ءمیں مسعود مفتی بحیثیت سیکٹری تعلیم اور صدیق سالک افواجِ پاکستان میں بطور کیپٹن مشرقی پاکستان میں تعینات کئے گئے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے عینی شاہد اور جنگی قیدی کی حیثیت سے ان کے تجربات ان کی افسانوی و غیر افسانوی نثر کا حصہ ہیں۔ غیر افسانوی ادب میں سقوطِ ڈھاکہ کی عکاسی کا جائزہ لینے کے لئے مسعود مفتی کی کتب لمحے، ہم نفس،چہرے اور مہرے جبکہ صدیق سالک کی تصانیف ہمہ یاراں دوزخ، میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، سیلوٹ کو تحقیق کا حصہ بنایا گیا ہے۔ اس موضوع کی اہمیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس مقالے کی بنیاد ان سوالات پر رکھی گئی ہے:

۱۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک کی غیر افسانوی نثر میں سقوطِ ڈھاکہ کے واقعات کی پیشکش اور نوعیت کیا ہے؟

۲۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک کی غیر افسانوی تحریروں میں سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے

نظریاتی مباحث کو کس طرح سے پیش کیا گیا ہے؟

۳۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک کی تحریروں میں واقعات کے بیان و اسلوب میں کن امور کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے؟

ان سوالات کی بنیاد پر اس مقالے کو تحریر کیا گیا اور اس سلسلے میں حتیٰ الامکان کوشش کی گئی کہ تمام سوالات کے جوابات ڈھونڈے جائیں۔ سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے پس منظر کا جائزہ لیا جانا ضروری تھا۔ اس لیے پہلے باب میں پس منظر کو سمیٹا گیا ہے۔ مقالے کے سوالات اور ابواب کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مسعود مفتی اور صدیق سالک کی تحریروں میں تمام ضروری فنی و فکری محاسن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں براہِ راست پیش آنے والے واقعات کے ساتھ ساتھ قابلِ بھروسہ عینی شاہدین کے واقعات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں تعینات ہونے کی وجہ سے زیر بحث مقالے کی دونوں شخصیات نے واقعات سے براہِ راست متاثر ہو کر لکھا ہے۔ مسعود مفتی کی مقالے میں شامل تینوں کتب خود مصنف کو پیش آنے والے حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ متاثرین کے ذاتی بیانات کو بھی سمیٹے ہوئے ہیں۔ انہوں نے بہت سے متاثرین کی مختصر مگر دل دہلا دینی والی سرگزشت کو بھی کتاب کا حصہ بنایا ہے۔ جبکہ صدیق سالک کی مقالے میں شامل تصانیف میں ان کے ذاتی تجربات، واقعات اور افواجِ پاکستان کا حصہ ہونے کی بنا پر ہر سیکٹر کے جنگی حالات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ یہ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوئی مجموعی جنگی صورتحال ان کی کتاب میں اہمیت کی حامل ہے۔

مقالے میں زیرِ بحث دونوں مصنفین نے واقعات کو بیان کرنے میں ترتیب و تسلسل کو مدِ نظر رکھا ہے۔ واقعات کا تاریخ وار بیان ان کی تحریروں کی اہم صفت ہے۔ حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے کہ پیش آئے واقعات کو وقت اور تاریخ کی مناسبت سے قاری کے سامنے پیش کیا جائے۔ اس ربط کو زیرِ بحث کتب میں ابتدا سے اختتام تک ملحوظِ خاطر رکھا گیا ہے۔ اپنی ذات سے وابستہ حالات و واقعات کو ترجیح دینے کے ساتھ ان مصدقہ واقعات کو بھی تحریر کا حصہ بنایا گیا ہے جو سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے اہمیت کے حامل ہیں، یوں ان دونوں مصنفین کی تحریریں بالواسطہ اور بلاواسطہ اثرپذیری کا امتزاج ہیں۔ ان کی تحریروں میں واقعات کی سچائی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ تحریر کا ہر پہلو حقائق اور دلائل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔ یوں تاریخ کا درست تعین کرنے اور سقوط کے حوالے سے قابلِ اعتبار حقائق تک پہنچنے میں مدد ملی ہے۔

محبِ وطن پاکستانی کی حیثیت سے جذبہ حب الاوطنی کا اظہار بھی ان کی تحریروں کو مزین کرتا ہے۔ اس حوالے سے جذباتیت کا عنصر ملک کے لئے ان کی محبت کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔ مقالے میں زیرِ بحث شخصیات نے ان حساس معاملات اور سیاسی پیچیدگیوں سے گریز کیا ہے جو ملکی سلامتی کے حوالے سے کتاب کو متنازع بنا دیتی ہیں ،اور اپنے ذاتی تجربات، احساسات، خیالات اور پیش آئے واقعات کو بیان کرنے کو ترجیح دی ہے۔ انہوں نے حقائق و شواہد کے ذریعے سقوطِ ڈھاکہ کے ہر پہلو کو قابلِ تسکین حد تک بیان کیا ہے۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک نے بطور جنگی قیدی بھی ہندوستان کی جیلوں میں قریباً دو سے اڑھائی برس گزارے، اس لئے قید کے چھوٹے موٹے واقعات، بحیثیت قیدی تجربات اور شخصیات کی نفسیات کا مطالعہ بھی ان کی تخلیقات میں شامل ہے۔ مگر اس حوالے سے صدیق سالک کی تحریریں زیادہ مفصل انداز کی حامل ہیں۔

مجموعی طور پر مسعود مفتی اور صدیق سالک کی تصانیف غیر جانبداری سے ضبطِ تحریر میں لائی گئی ہیں مگر صدیق سالک کے اندازِ بیاں میں کہیں کہیں چند کردار ہر لحاظ سے معتوب قرار پائے ہیں۔ لیکن ایسے معتوب کرداروں کے اُٹھائے گئے غلط اقدامات کا ثبوت حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ میں موجود ہے۔ ملکی سالمیت کو داؤ پر لگانے والے محرکات کے متعلق مسعود مفتی اور صدیق سالک نے اپنے مخصوص انداز میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ ادبی و سیاسی طور پر ان باشعور شخصیات نے ملک کو تباہ کر دینے والے واقعات کے بارے میں اپنے نظریات کو کھلم کھلا بیان کیا ہے۔ پاکستان بننے کے بعد سے ملک کی سیاسی تاریخ جن سازشوں کا شکار رہی تھی اس سے متعلق مسعود مفتی کے نظریات نے قاری کو تاریخ کا سچا مگر تاریک پہلو دکھایا ہے۔

تاریخی پس منظر سے متعلق صدیق سالک کا اظہارِ خیال تحریروں میں بہت کم دکھائی دیتا ہے۔ دیگر نظریات کو پرکھیں تو دونوں شخصیات نے بنگالیوں کے احساسِ محرومی سے پہلو تہی نہیں کی ہے۔ انہوں نے ان کے احساسِ محرومی کی ایک وجہ مغربی پاکستان کی بااثر شخصیات کے رویوں کو بھی قرار دیا ہے۔ اس میں ہر محکمے کے اُن ناانصاف افسران بالا کو شامل کیا جاسکتا ہے جو اس سانحے سے قبل مشرقی پاکستان میں تعینات تھے۔ یہاں دونوں مصنفین نے مثالیں دے کر اپنے نظریے کی تصدیق کی ہے۔ جس میں صدیق سالک نے معاشی حالت سے متعلق اپنے ذاتی تجربات کو پیش کیا ہے۔ بطور سیکٹری تعلیم مسعود مفتی نے بہت مدلل انداز میں ہمارے تعلیمی نظام کی ان کوتاہیوں کو بیان کیا ہے جو ہمارا آدھا ملک کھا گئیں۔ انہوں نے نصاب کا کلکتہ سے چھپنا، تعلیمی اداروں میں ۹۰ فیصد سے زائد ہندو اساتذہ کا ہونا اور مقامی لوگوں میں قومیت پرستی کو کوٹ کوٹ کر بھرا جانا بھی سقوط کی بنیادی وجوہات قرار دی ہیں۔ ۱۹۷۴ء کے بعد

سے ہمارے تعلیمی نظام میں کی گئی کوتاہیاں ان کے نزدیک ہمیں تاریخ کا مجرم بناتی ہیں اور اس بات کا ثبوت بہت سے مصنفین کی کتب اور خود حمود الرحمٰن کمیشن کی رپورٹ میں ملتا ہے۔

مسعود مفتی نے ایک اور اہم مسئلے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے اور بہت سے عینی شاہدین کی گفتگو کو شامل کرتے ہوئے بتایا کہ بنگالیوں کی اکثریت علیحدگی نہیں چاہتی تھی بلکہ وہ پر امن طریقے سے متحدہ پاکستان میں رہنا چاہتے تھے۔ بنگالیوں کی حمایت میں صدیق سالک کا نظریہ ان کی اپنی ذات کے حوالے سے سامنے آیا ہے، جہاں وہ اپنے ساتھ بنگالیوں کے اچھے سلوک کو پیش کرتے ہیں۔ اس مثبت پہلو کے ساتھ تصویر کا ایک تاریک رخ بھی ہے۔ مسعود مفتی اور صدیق سالک نے خانہ جنگی سے قبل، دورانِ جنگ اور اس کے بعد کے فسادات میں ان مظالم کا بھی ذکر کیا ہے جو کہ بنگالیوں کی طرف سے غیر بنگالیوں پر ڈھائے گئے تھے۔ اس حوالے مسعود مفتی نے عینی شاہدین کے واقعات کو پیش کرتے ہوئے اپنے نظریات قائم کئے ہیں۔ متاثرین کی زبانی پیش کی گئی سرگزشت اس بات کا ثبوت ہے کہ بنگالیوں نے بے پناہ لوگوں کو برے طریقے سے موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ اس حوالے سے مقالے میں نامور مصنفین کی آرا اور ان کی کی گئی تحقیق، عینی شاہد کا انٹرویو میں دیا گیا بیان بھی مسعود مفتی کے نظریات کی تصدیق کرتا ہے۔ صدیق سالک نے مظالم کے حوالے سے تفصیلاً گفتگو نہیں کی ہے۔

حالتِ جنگ میں جہاں بنگالیوں نے تشدد کیا وہیں تشدد اور زیادتی کے چند ایک واقعات آرمی ایکشن کے دوران افواجِ پاکستان کی طرف سے بھی سامنے آتے ہیں۔ صدیق سالک نے نو(۹) ایسے واقعات کی تصدیق کی ہے اور اس حوالے سے اعلیٰ افسران کی طرف سے ان کے خلاف کی گئی کاروائیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ مسعود مفتی نے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ کا جو حصہ اپنی کتاب چہرے اور مہرے میں شامل کیا ہے، اس میں بھی افواجِ پاکستان کی طرف سے ایسے واقعات کی شہادت موصول ہوئی ہے اور ان عسکری حکام کے خلاف کاروائی کی درخواست بھی کی گئی ہے۔ دونوں مصنفین کی اس حوالے سے پیش کی گئی تحقیق کی تصدیق سرمیلا بوس کی کتاب سے بھی کی گئی ہے۔ مگر عینی شاہدین نے اس حوالے سے کسی بھی قسم کے واقعے کی تصدیق نہیں کی اور افواجِ پاکستان کے مثبت کردار کو ہی پیش کیا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان کے علم میں ایسا کوئی واقعہ نہ ہو مگر کچھ ایسے واقعات پیش آئے تھے۔ اس کے باوجود چند کالی بھیڑوں کی وجہ سے ساری افواجِ پاکستان جو کہ ایک معتبر ادارہ ہے کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ جنگ کے حوالے سے افواجِ پاکستان کی قربانیاں بے مثال ہیں اور اس بات کی تصدیق خود مسعود

مفتی اور صدیق سالک کی تصانیف میں موجود ہے نیز حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ، مصدقہ کتب اور عینی شاہدین کے بیانات بھی اس بات کے گواہ ہیں۔

مقالے میں مسعود مفتی اور صدیق سالک کے دوران قید کے واقعات کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ اس میں بھارتی حکام اور سپاہیوں کے انسانیت سوز رویوں کے واقعات اور بے رحمانہ سلوک کی مثالیں بھی ان کی تحریروں کا حصہ ہیں۔ اس حوالے سے راقمہ نے کرنل مقبول حسین جو ۱۹۷۱ء کی جنگ میں قیدی رہے ہیں کا بھی انٹرویو کیا ہے، اور ان کی کتب زندہ رہے گا پاکستان اور کیمپ ۴۵ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ان میں دورانِ قید بھارتی سپاہیوں اور افسران کے ظالمانہ رویوں کا حوالہ موجود ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں مصنفین کے مطابق جینوا کنونشن کی قیدیوں کے لئے جاری کردہ ہدایات کی شدید خلاف ورزی کی گئی اور قیدیوں سے انتہائی دردناک سلوک روا رکھا گیا۔ ملک کی تقسیم کے محرکات میں اپنا نظریہ پیش کرتے ہوئے مسعود مفتی اور صدیق سالک نے فوجی ایکشن کو غلط قرار دیا ہے۔ ان کے مطابق اس مسئلے کا سیاسی حل تلاش کیا جانا ملک کے حق میں بہتر ہوتا۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ نے بھی اس معاملے کو سیاسی طور پر حل کئے جانے کو ہی درست تسلیم کیا ہے اور فوجی ایکشن کی مخالفت کی ہے۔

فنی نقطہ نظر سے بھی مقالے میں مسعود مفتی اور صدیق سالک کی تحریروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دونوں شخصیات نے ادبی و فنی لوازمات سے مسجع غیر افسانوی نثر پیش کی ہے۔ مسعود مفتی کی نثر سادہ اندازِ بیاں کی حامل ہے جبکہ صدیق سالک نے کسی حد تک مشکل الفاظ میں مگر ادبی لحاظ سے بہترین نثر تحریر کی ہے۔ ان کی تصانیف میں غیر روایتی تشبیہات، علامات اور استعارات کا استعمال ہوا ہے جو اس سانحے کی روداد کو بیان کرنے میں معاون رہا ہے۔ انہوں نے نہایت سچائی کے ساتھ حقیقت کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اپنی بات کے مفاہیم کو واضح کرنے کے لئے مسعود مفتی اور صدیق سالک نے اشعار اور مصرعوں کا بھی سہارا لیا ہے جو حالات و واقعات کی نوعیت واضح کرنے میں نہایت معاون رہے ہیں۔ کہیں کہیں فارسی محاورات کا استعمال بھی ان کی غیر افسانوی نثر کا حسن بڑھاتے ہیں۔ صدیق سالک کی تحریر کی ایک نمایاں اور اضافی خوبی ان کا مزاحیہ انداز ہے جو سنگین حالات کے باوجود بھی برقرار رہتا ہے مگر تحریر کو مضحکہ خیز نہیں بناتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ طنز کی کاٹ دونوں مصنفین کے ہاں پائی گئی ہے جو کہیں احتسابی عمل کی تشریح میں نہایت معاون رہی ہے تو کہیں اربابِ اختیار کی سازشوں کو بے نقاب کرتی ہے۔

کردار نگاری کے نقطے کی طرف نگاہ دوڑائیں، تو مسعود مفتی کی تحریر کا حقیقی کردار بھولا ان تمام نظریات، حالات و واقعات اور نفسیات کو بیان کرتا ہے جو خود مصنف کہنا چاہتے ہیں۔ بھولا کے مرکزی کردار کے علاوہ مسعود مفتی نے صدر آغا محمد یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو، شیخ مجیب الرحمٰن اور جرنل نیازی کے حوالے سے مختصراً اپنا نظریہ پیش کیا ہے مگر نہایت مدلل انداز میں حقائق کو پیش کیا ہے اور ان کو مسخ نہیں ہونے دیا۔ ان کے برعکس صدیق سالک نے درج بالا تمام کرداروں پر تفصیلاً گفتگو کی ہے۔ اپنے ذاتی تجربات کی بنیاد پر ان کے سیاسی و ذاتی اقدامات کی طنزیہ انداز میں مذمت کی ہے۔ یوں دونوں مصنفین نے ان معتوب کرداروں کو بھی ملک توڑنے کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ اس بات کی تصدیق حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ نے بھی کی ہے کہ ان کرداروں نے ملک کو توڑنے میں اپنی اپنی استطاعت کے مطابق ہوس و سازش سے کام لیا اور اپنے ماتحت لوگوں کا بھی استعمال کیا ہے۔ درج بالا عسکری و سیاسی کرداروں کی کردار نگاری میں مسعود مفتی اور صدیق سالک نے دلائل، حقائق اور ذاتی تجربات کو بنیاد بنایا ہے۔

دورانِ تحقیق حقیقت نگاری کا عنصر بھی مسعود مفتی اور صدیق سالک کی تحریروں میں بدرجہ اتم دیکھا گیا ہے۔ جنگی فسادات، قید و بند کی صعوبتیں اور دیگر حالات و واقعات کو حقیقت سے نہایت قریب رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ واقعات کا من و عن بیان اور ان کو پیش کرنے کا انداز ہر واقعے کی سچائی کی دلیل ہے۔ حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ منظر نگاری میں بھی دونوں مصنفین نے کمال مہارت سے کام لیا ہے۔ انہوں نے حسین یادوں کے ساتھ ساتھ سقوطِ ڈھاکہ کے تلخ واقعات کی منظر نگاری بھی جانفشانی سے کی ہے۔ دیگر ادبی خوبیوں کے ساتھ ساتھ جذبات نگاری جیسی اہم خصوصیت نے ان کی غیر افسانوی نثر کو افسانوی حسن عطا کیا ہے۔ اس سے ان کے خیالات کو جاننے میں بھی مدد ملی ہے۔

مسعود مفتی نے قرآن کی آیاتِ مبارکہ کی روشنی میں انفرادی سطح سے قومی سطح تک احتسابی عمل پر زور دیا ہے۔ ان کے نظریات کے مطابق اس سانحے کے اسباب میں ہماری اخلاقی برائیاں بھی بہت حد تک معاون رہی ہیں اور یہ ایک تلخ حقیقت ہے۔ ان کی رائے اور دیگر نامور مصنفین بھی اس بات کی حمایت کرتے ہیں کہ ہم نے ماضی کی غلطیوں سے کچھ نہیں سیکھا اور بطور قوم اپنا طرزِ عمل درست نہیں کیا۔ صدیق سالک نے افواجِ پاکستان سے وابستگی کی بنیاد پر اپنی ذاتی رائے دیتے ہوئے ایک پر امید نظریہ قائم کیا ہے۔ ان کے مطابق اتنے برس بعد افواجِ پاکستان میں نہایت مثبت اور نمایاں تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ ان کی اس بات کی تصدیق ہمارا موجودہ دفاعی نظام بھی ہے۔ جس میں

پاکستان آرمی نے بے پناہ قربانیاں دیتے ہوئے اس کو شفاف اور مستحکم بنانے میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ جبکہ مسعود مفتی کے نظریات کے مطابق ہم آج بھی ان برائیوں میں گھرے ہیں جو قوموں کی تباہی کا سبب بنتی ہیں۔ یوں یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ہم نے سقوطِ ڈھاکہ کے بعد اپنی دفاعی حالت کو تو قوی بنایا، مگر ذاتی سطح پر اپنے کردار میں وہ اعلیٰ صفات پیدا کرنے سے قاصر رہے ہیں جو قوموں کی ترقی کی ضامن ہیں۔ غرض مسعود مفتی اور صدیق سالک کی سقوطِ ڈھاکہ کے حوالے سے مقالے میں شامل غیر افسانوی نثر درست واقعات، قابلِ بھروسہ نظریات اور بہترین اسلوب کا مجموعہ ہے۔ یہ کتب تاریخی اعتبار سے محققین اور قاری کو بہت سی سچائیوں سے آشنا کراتی ہیں۔ ان کی تحریریں ہر دور میں اس عظیم سانحے کے متعلق حقائق کو سامنے لانے میں معاون و مددگار رہیں گی۔

کتابیات

اختر، محمد ریاض۔ "سانحہ مشرقی پاکستان سے ہم کچھ نہ سیکھ سکے "مشمولہ نوائے وقت۔ لاہور: ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء۔

اعوان، ظہور احمد۔ داستان تاریخ رپوتاژ نگاری۔ پشاور: صدر ادارہ علم و فن پاکستان، ۱۹۹۹ء۔

امام، جہاں آرا۔ اکہتر کے وہ دن۔ مترجم منور مہدی۔ لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۷ء۔

انصاری، محمد دل شیر علی۔ راقمہ سے براہ راست انٹرویو۔ بہاری کالونی راولپنڈی: ۸ دسمبر ۲۰۱۹ء۔ دوپہر ۱:۱۵۔

بوس، سرمیلا۔ ڈھاکہ کہانی کچھ اپنی کچھ غیروں کی زبانی *(Dead Reckoning Memories of the Bangladesh War 1971)*۔ مترجم نذر حسین کاظمی۔ لاہور: اظہار پرنٹرز، ۲۰۱۳ء۔

بھٹو، ذوالفقار۔ عظیم المیہ۔ لاہور: حاجی حنیف پرنٹرز، ۲۰۱۳ء۔

جعفری، ضمیر۔ "طلسمی مندری والی کتاب" مشمولہ کتابی چہرے۔ راولپنڈی: مکتبہ نیرنگ خیال، ۱۹۸۹ء۔

حسین، مقبول۔ راقمہ سے واٹس ایپ انٹرویو۔ جولائی ۲۰۱۹ء۔ دوپہر ۱۲:۱۵۔

حسین، مقبول۔ کیمپ ۳۵۔ راولپنڈی: حرف اکادمی، ۲۰۰۵ء۔

حسین، مقصودہ۔ مسعود مفتی: شخصیت اور فن۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء۔

خان، محمد اشفاق، ہاشمی، سید فضیل (مترجمین)۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ۔ لاہور: طیب شمشاد پرنٹرز، ۲۰۱۸ء۔

دالیم۔ شریف الحق۔ پاکستان سے بنگلہ دیش ان کہی جدوجہد۔ مترجم رانا اعجاز احمد۔ لاہور: جمہوری پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء۔

روزنامہ ڈان۔ ۱۰ فروری ۱۹۷۱ء۔

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۔ ۱۶ دسمبر ۲۰۰۴ء۔

ساگر، طارق اسماعیل۔ حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ آخری سگنل کی کہانی، (لاہور: ساگر پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء۔

سالک، صدیق۔ ہمہ یاراں دوزخ۔ لاہور: آر آر پرنٹرز، ۲۰۱۶ء۔

سالک، صدیق۔ میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا۔ لاہور: الفیصل پرنٹرز، ۲۰۱۷ء۔

سالک، صدیق۔ سیلوٹ۔ لاہور: محبوب پرنٹرز، ۲۰۱۷ء۔

سعید الدین۔ مشرقی پاکستان کا زوال۔ لاہور: آئینہ ادب، ۱۹۸۰ء۔

شہاب، قدرت اللہ، شہاب نامہ۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۴ء۔

عبدالرؤف۔ راقمہ سے براہ راست انٹرویو۔ بہاری کالونی راولپنڈی: ۱۸ اگست ۲۰۱۹ء۔ دوپہر ۱۲:۳۵۔

عزیز، قطب الدین۔ خون اور آنسوؤں کا دریا (Blood and Tears)۔ مترجمین سلیم منصور خالد، ظہور احمد قریشی۔ لاہور: دی میسج پریس، جنوری ۲۰۱۷ء۔

عنایت اللہ۔ ہماری شکست کی کہانی۔ لاہور: حکایت پبلیشرز، جنوری ۲۰۱۴ء۔

فاروق، شریف۔ "سحر افروز مسکراہٹ" مشمولہ نوائے وقت میگزین۔ لاہور: ۹ ستمبر ۱۹۸۸ء۔

کمال متین الدین۔ نسلوں نے سزا پائی بحران ڈھاکہ ۱۹۶۸۔۱۹۷۱ (*Tragedy of Errors: East Pakistan Crisis 1968-1971*)، مترجم ڈاکٹر محمد شیراز دستی۔ لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۸ء۔

محمود، صفدر۔ پاکستان کیوں ٹوٹا۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء۔

مطیع الرحمٰن، ڈاکٹر۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی بھارت اور بڑی طاقتوں کا کردار۔ تلخیص و ترجمہ شمیم شاہ آبادی۔ لاہور: نظریہ پاکستان پرنٹرز، ۲۰۱۸ء۔

مفتی، مسعود۔ چہرے اور مہرے۔ اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء۔

مفتی، مسعود۔ راقمہ سے واٹس ایپ انٹرویو۔ ۲۰ اگست ۲۰۱۹ء۔ شام ۶:۲۴۔

مفتی، مسعود۔ ہم نفس۔ لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۶ء۔

مفتی، مسعود۔ لمحے۔ اسلام آباد: دوست پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء۔
مفتی، مسعود۔ "میں کیوں لکھتا ہوں ....؟" مشمولہ روزنامہ جنگ۔ راولپنڈی: ۱۸ مئی ۲۰۰۱ء۔
نصیر الدین، حاجی۔ راقمہ سے براہ راست انٹر ویو ۔ بہاری کالونی راولپنڈی: ۸ دسمبر ۲۰۱۹ء۔ دوپہر ۲:۰۵۔
نیازی، خان، امیر عبداللہ۔ میں نے ہتھیار کیوں ڈالے۔ ترتیب و تدوین وسیم شیخ ۔ لاہور: فیکٹ پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء۔

ضمیمہ جات

۱۔ سوالنامے کے جوابات (بذریعہ واٹس ایپ)

۲۔ ہجرت کرنے والے عینی شاہدین کی تصاویر (مختصر تعارف)

زیر نظر تحقیق غیر افسانوی ادب میں سقوطِ ڈھاکہ کی عکاسی : بحوالہ خصوصی مسعود مفتی اور صدیق سالک کاایک اہم حصہ انٹرویوز پر مبنی ہے۔ جن میں مسعود مفتی اور کرنل مقبول حسین سے کئے گئے سوالات کے جوابات بذریعہ واٹس ایپ تصویری صورت میں موصول ہوئے، جو ضمیمہ نمبر ایک میں پیش کئے گئے ہیں۔ ان کا تحریری متن مقالے میں شامل کیا گیا ہے۔ ضمیمہ نمبر دو میں ہجرت کرنے والے ان عینی شاہدین کی تصاویر ہیں جو اِس وقت راولپنڈی کی بہاری کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔ تصاویر کے ساتھ مختصر تعارف بھی اس ضمیمہ میں شامل ہے۔

سوالنامہ۔ از (مسز ماریا (MARIA) - اسلام آباد

سوال نمبر 1: مختصر جواب تو یہ ہے کہ ہماری سیاسی قیادت زیادہ تر وڈیروں اور فیوڈلز پر مشتمل تھی - ان کا عسکری قیادت سے گٹھ جوڑ تھا - اس لئے ایسے مسترداد حالات میں ان دونوں کا عمل دخل تھا - مگر مفصل جواب کے لئے دیکھیں میرا مضمون بعنوان VERDICT OF HISTORY - "چہرے اور مہرے" - صفحات 101 اور 114 - اس کے علاوہ دیگر صفحات دیکھیں: 98، 139، 145، 147، 150، 151، 158، 163، 211 اور 218 تا 227 -

سوال نمبر 2: ان کے اس کی محرومی کی وجہ صرف ایک ہی تھی - بد اعتمادی --- گو اس کی شکلیں بدلتی رہیں - سب سے پہلے تو یہ بد اعتمادی زبان کے معاملے میں پیدا ہوئی - جب دو قومی زبانوں کی بجائے صرف اردو قومی زبان قرار دی گئی - اس کے بعد آئین سازی میں تاخیر کے دوران یہ بد اعتمادی بڑھتی گئی - کہ انہیں اقتدار میں آبادی کے تناسب سے حصہ دینے سے گریز ہے - لیکن ساتھ ہی ہمارے نوآموز سیاستدانوں کا شعور بھی پختہ ہو رہا تھا - اس لئے ایک دہائی میں انہوں نے یہ دونوں مسائل حل کر لئے اور 1956 کا آئین بنتے سے باہمی اعتماد مکمل طور پر بحال ہو گیا - اگر اس کے مطابق اسی وقت الیکشن ہو جاتے - تو متحدہ پاکستان آج بھی قائم ہوتا - لیکن 1958 میں آئین توڑ ڈالا گیا - تو بد اعتمادی پھر سر اٹھانے لگی - کیونکہ مغربی ڈکٹیٹر اور وڈیروں کا مجموعہ کوشش کرتے رہتے کہ اقتدار کا مرکز صرف ان کے ہاتھ میں رہے - اور مشرقی پاکستان ان کے زیر اثر رہے - پھر اسی رسہ کشی میں رسہ ٹوٹ گیا - کیونکہ جنرل یحییٰ اور بھٹو دونوں شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار نہیں سونپنا چاہتے تھے - اور پھر کی اسی رسہ کشی کو جس طرح ہم نے مشرقی پاکستان کی سرزمین پر دہرایا اس کی ساری داستان میری کتاب "ہم نفس" میں موجود ہے - اسی طرح "چہرے اور مہرے" کے صفحات 132 سے 170 تک میں بھی یہی وجوہات جھلک رہی ہیں -

سوال نمبر 3: مثل مشہور ہے - کہ خانہ خالی را دیو می گیرد (خالی گھر پر بھوت بسیرا کر لیتے ہیں) - جب ہمارے اپنے حاکموں اور لیڈروں کی طرز حکومت (GOVERNANCE) نیک نیتی اور حب الوطنی سے خالی ہونے لگی - تو باہر والے دخل اندازی پر اتر آئے - اگر ہم اپنے گھر کا نظام خود خراب نہ کرتے - تو باہر والوں کی مداخلت کا جواز نہ بن سکتا تھا - متعلق صفحات درج ذیل ہیں: "چہرے اور مہرے" - 238 تا 241، 204 تا 206 - "ہم نفس": 63 تا 70، 75 تا 81، 86 تا 94، 98، 99، 104، 112 -

سوال نمبر 4: تہذیبی اور لسانی اختلافات محض سطحی سے تھے - اور ان کی وجہ سے کوئی دوری نہ تھی - بلکہ پاکستان کے پہلے گیارہ برسوں میں کسی قسم کی دوری کا شائبہ تک نہ تھا - اور زبان کے مسئلے پر بھی بھائیوں کے درمیان خانگی جھگڑے جیسا ماحول تھا - لیکن 1958 کے

بعد

بعد میں آنے والے تمام حاکم اپنے اپنے اقتدار کو دوام دینے کے لئے صوبوں میں دوریاں پیدا
کرتے رہے۔ اور انگریزوں والی DIVIDE AND RULE والی حکمت عملی اپناتے
رہے۔ میری کتاب "ہم نفس" کے واقعات اور کرداروں میں جو ملا کا کردار بالخصوص
اور دیگر بے نام کردار بالعموم انہی باتوں کی تائید کرتے ہیں۔ اس قسم کے دیگر مبنی
حقائق کی مزید تفصیلات میں نے اپنی رپورتاژ "دو سینار" میں دی ہیں۔ جو لاہور
سے شائع ہونے والے ماہنامے "الحمراء" میں تین برس تک سلسلہ وار شائع ہوتی
رہی (جنوری 2014 سے 2017 تک) اور اب کتابی شکل میں چھپ رہی ہے۔

1906 میں مسلم لیگ کا قیام بنگال میں ہوا۔ پھر تو تحریک ساری
تحریک پاکستان میں بنگالی پیش پیش اور نمایاں رہے۔ بلکہ قیام پاکستان کے بعد بھی محض ان
کے ایثار کی وجہ سے ہی [PARITY کا فارمولا) ممکن ہو سکا۔ کہ 1956 کا آئین
بن سکا۔ میں ہرگز تسلیم نہیں کرتا۔ کہ تہذیبی اور لسانی فرق کی وجہ سے کوئی دوری تھی۔
(ایک ہی خاندان میں سگے بھائی بہنوں کی مختلف شکل و سیرت کی طرح)۔ بلکہ اس مصنوعی دوری
کا غلط پروپیگنڈہ ادارہ قائم کرتے رہے۔ جنہوں نے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کے لئے
یہ دوریاں دانستہ پیدا کی تھیں۔ اور بعد ازاں مشرقی پاکستان کو خود سے علیحدہ کرنے کے
لئے جان بوجھ کر ایسے حالات پیدا کئے۔ کہ وہ علیحدہ ہو جائیں۔ اور یہ باقی ماندہ
پاکستان پر حسب سابق اقتدار پر قابض رہیں۔ اس کی تفصیلات بھی آپ کو رپورتاژ
"دو سینار" میں مل جائیں گی۔

سوال نمبر 5 :— اس کا جواب آپ کو "ہم نفس" کے صفحات 83 تا 94 میں مل جائے گا۔

سوال نمبر 6 :- اس کے علاوہ اور کوئی حل نہ تھا۔ کہ الیکشن کے بعد جیتنے والے کو اقتدار
منتقل کر دیا جاتا۔ اور بعد کے حالات کے مطابق نئی حکمت عملی وضع کی جاتی۔

سوال نمبر 7 :- مجیب الرحمان
کے کردار کے متعلق میرا نقطہ نظر "بکھرے اور نکھرے" میں موجود ہے (مضمون VERDICT
OF HISTORY) صفحہ 109

سوال نمبر 8 :- اس کا جواب پہلے سوال کے جواب میں شامل ہے۔

سوال نمبر 9 :- سقوط ڈھاکہ کوئی ایک دن کا وقوعہ نہ تھا۔ بلکہ طویل خانہ جنگی کا اختتام
تھا۔ خانہ جنگی بہت بھیانک صورت حال ہوتی ہے۔ گلی گلی، گھر گھر بلکہ بعض دفعہ
ایک ہی گھر کا فرد فرد آپس میں متحارب ہوتا ہے۔ ایسے حالات میں ایک مرد کریمی بھی دو
متحارب گروہوں میں بٹ جاتی ہے۔ 1971 میں بھی ایسا ہی ہوا۔ میری کتاب
"ہم نفس" کے سبھی کردار اسی کڑوی حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں۔ جو ملا۔ ڈاکٹر حسن زمان

ڈاکٹر سجاد حسین پرخلوص اور پکے پاکستانی تھے۔ لیکن جیب سکرٹری خلیق الاعظم ۔
عبدالستار اور عطاء الحق علیحدگی کے علمبردار تھے۔ اور یہ تقسیم ساری یونیورسٹی میں بڑے
وسیع پیمانے پر تھی۔ بلکہ کئی یونیورسٹی تو جنگ سے پہلے ہی پاکستان کی صفوں سے نکل کر
فرار ہو چکے تھے۔ بلکہ حمود الرحمان کمیشن نے فوج میں بھی ایسے عناصر کی نشاندہی کی ہے۔ جس
کا ذکر "چہرے اور مہرے" میں صفحہ 123 کے بعد بڑے واضح انداز میں ہو چکا ہے۔

سوال نمبر ۱۰:- فوجی ایکشن 25 مارچ کی حد تک درست تھا۔ کہ کھلی بغاوت کو دبانا ضروری
تھا۔ لیکن باغیوں کی سرکوبی کے بعد سیاسی عمل کی ضرورت تھی۔ اور فوج کی دخل اندازی کا
کوئی جواز نہ تھا۔ میری کتاب "ہم نفس" کے صفحہ 151 پر درج ہے۔ اس کے بعد کے
۲ اوراق اسی غفلت کے مہلک نتائج کا احوال پیش کرتے ہیں۔

سوال نمبر ۱۱:- "چہرے اور مہرے" میں صفحہ 205 سے آگے پڑھتے جائیں۔ تو صفحہ 226 پر
پہنچ کر آپ کو اپنے سوال کا جواب مل جائے گا۔

سوال نمبر ۱۲:- "چہرے اور مہرے" میں دیگر مقامات کے علاوہ صفحہ 170 سے آگے پڑھتے جائیں
تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے ہی سقوط ڈھاکہ ہوا (صفحہ 211)

سوال نمبر ۱۳:- جواب کے لئے دیکھیں "چہرے اور مہرے" - صفحہ 215 تا 217

سوال نمبر ۱۴:- یہ خانہ جنگی تھی۔ جس میں قتل و غارت کا جنون دونوں طرف سوار تھا۔ بلاشبہ
دونوں طرف سے مظالم ڈھائے گئے۔ میری کتاب "لمحے" میں آپ کے اس سوال کے
بہت سے جوابات موجود ہیں۔ اور ان سب کو آخری مضمون "لمحوں کی سوچ" میں باہم
مربوط کر دیا گیا ہے۔

سوال نمبر ۱۵:- حمود الرحمان کمیشن رپورٹ کے بارے میں آپ کو شک کیوں ہے؟ اگر آپ کتاب
"چہرے اور مہرے" میں صفحہ 115 سے آگے کمیشن کا تعارف پڑھ لیں۔ تو ان کی
محنت۔ دیانت۔ عرق ریزی۔ گہرائی اور گیرائی۔ خلوص اور دردمندی دیکھ کر یہ شک رفع
ہو جانا چاہئے۔ 1971 کے دوران میں ڈھاکہ کے گلی کوچوں۔ دیہاتوں اور دور دراز
علاقوں میں جو کچھ دیکھتا رہا۔ اس کی نہایت واضح شکل اس رپورٹ سے ابھرتی ہے۔
اور اس کا ہر ایک لفظ حقیقت کے بالکل قریب لے جاتا ہے۔ اسی وجہ سے اس رپورٹ
کو قریباً تین دہائیوں کے لئے زیر زمین دفن کر دیا گیا۔ یہ رپورٹ 1974 میں
حکومت کو پیش کر دی گئی تھی۔ اگر اسی وقت اس کی سفارشات پر عمل کر کے مزید
انکوائری اور کورٹ مارشل مکمل ہو جاتے۔ تو باقی ماندہ حقائق بھی کھل کر سامنے آ جاتے۔
اور قوم کو اصل واردات کا پورا ادراک ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس
رپورٹ کے آخری حصے کا اردو میں ترجمہ کیا اور اپنی اسی کتاب میں شامل کیا
جو درحقیقت ایک عینی شاہد کا بیان اور گواہی ہے۔ اور اس رپورٹ میں بھی عینی گواہوں

(اگلے صفحے پر)

کی شہادتیں درج کی گئی ہیں۔

سوال نمبر 16:- "ہماری قوم" کی اصطلاح کا اطلاق پاکستان پر نہیں ہوتا۔ اس ملک میں "ایک قوم" کی بجائے "دو منزلہ آبادی" بستی ہے۔ اوپر حاکم نیچے محکوم۔ اوپر والے اپنی ذات کو ترجیح دیتے ہیں نیچے والے سب کی بھلائی کو۔ 1971 میں اوپر والوں نے زیادہ آبادی والے مشرقی پاکستان کو صرف اس لئے علیحدگی کی طرف دھکیل دیا۔ کہ وہ بآواز بلند تنقید و تبصرہ کرتے تھے۔ اور اس طرح ان کے ذاتی مفادات کے پھیلاؤ کے لئے خطرہ تھے۔ ("چہرے اور مہرے" - صفحہ 98) - یہی وجہ ہے۔ کہ سقوط ڈھاکہ جہاں نیچے والوں کے خیال میں ایک شکست فاش تھی۔ وہاں اوپر والے اسے اپنی فتح سمجھتے تھے۔ کیونکہ مشرقی پاکستان نے یہ رشتہ توڑنے میں ان کے عزائم کی نفی کی تھی۔ اسی لئے ان کی کوشش ہے۔ کہ تاریخ اور پاکستانی قوم اس عظیم سانحے کو یکسر فراموش کر دے۔ جیسے یہ ہوا ہی نہیں۔ اور یہ اس میں ہی کامیاب ہیں۔ کیونکہ جن قوتوں نے ملک توڑا وہ کسی نہ کسی شکل میں تب سے اب تک اقتدار سے وابستہ چلی آ رہی ہیں۔

مسعود مفتی

اسلام آباد - 20 اگست 2019

سوال نمبر 1

سوال نمبر 2

سوال نمبر 3

سوال نمبر 4

کی کمزوری کا احساس ہو رہا تھا گیا۔ چنانچہ سرحدی علاقوں میں فوج
اپنی جنگ لڑ رہی تھی اور بھارت کے حامی ملیشیا/ایئر فورس نے قبضہ کرنے کی
کوشش کی ہر دو جانب [illegible] عمل در آمد کیا۔
اگر [illegible] کم تھی۔ ایئر فورس ناکافی تھی۔ مورال تباہ ہو چکا تھا
ایک طرف بھارت دوسری طرف مکتی باہنی (مشتعل عوام)
مورچہ سنبھالا تھا۔ جب کسی جگہ عوام بپھر جائیں تو بحران کو روکنا
مشکل نہیں ہونا چاہئے اس طرح لڑائی میں ان سب عوامل کی وجہ سے
شکست ہو گئی۔ امیر عبداللہ نیازی کم اور جنرل یحییٰ زیادہ قصوروار ہے

سوال 5.

شیخ مجیب الرحمٰن شروع میں علیحدگی پسند نہیں تھا وہ سیاسی حق
مانگ رہا تھا۔ اگر عوامی لیگ الیکشن جیت گئی تھی تو جنرل یحییٰ
اور مسٹر بھٹو کو ادھر تم اور ادھر ہم کے نعرے کو بھلا کر
تمام سیاسی عناصر کی گول میز کانفرنس بلا کر سیاسی حل تلاش کرنا
چاہیئے تھا جس میں سیاستدانوں نے حیل و حجت کی اور یہ رات دیکھنا پڑا
پرامن حل [illegible] شیخ مجیب الرحمٰن سے سیاسی سمجھوتے ہی میں تھا۔

سوال نمبر 6

حمود الرحمٰن رپورٹ پہلے تو شائع نہ ہوئی عوام بے خبر رہے
بعد میں منظر عام پر لائی گئی مگر رپورٹ کی Recommendations
پر آج تک عمل نہیں کیا گیا ایسا لگتا ہے کہ
لیڈرشپ اور عوام دونوں نے اس واقعے سے کوئی سبق حاصل
نہیں کیا۔ چھوٹے صوبوں کی حق تلفی، کرپشن، اقربا پروری
اور سیاسی کرپشن بدستور جاری ہے۔
جو کہ قوم و ملک کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے
اس کے بعد بھی عسکری مارشل لا اس کا ثبوت ہے کہ
مکمل لیڈرشپ ہی مجبور رہی۔

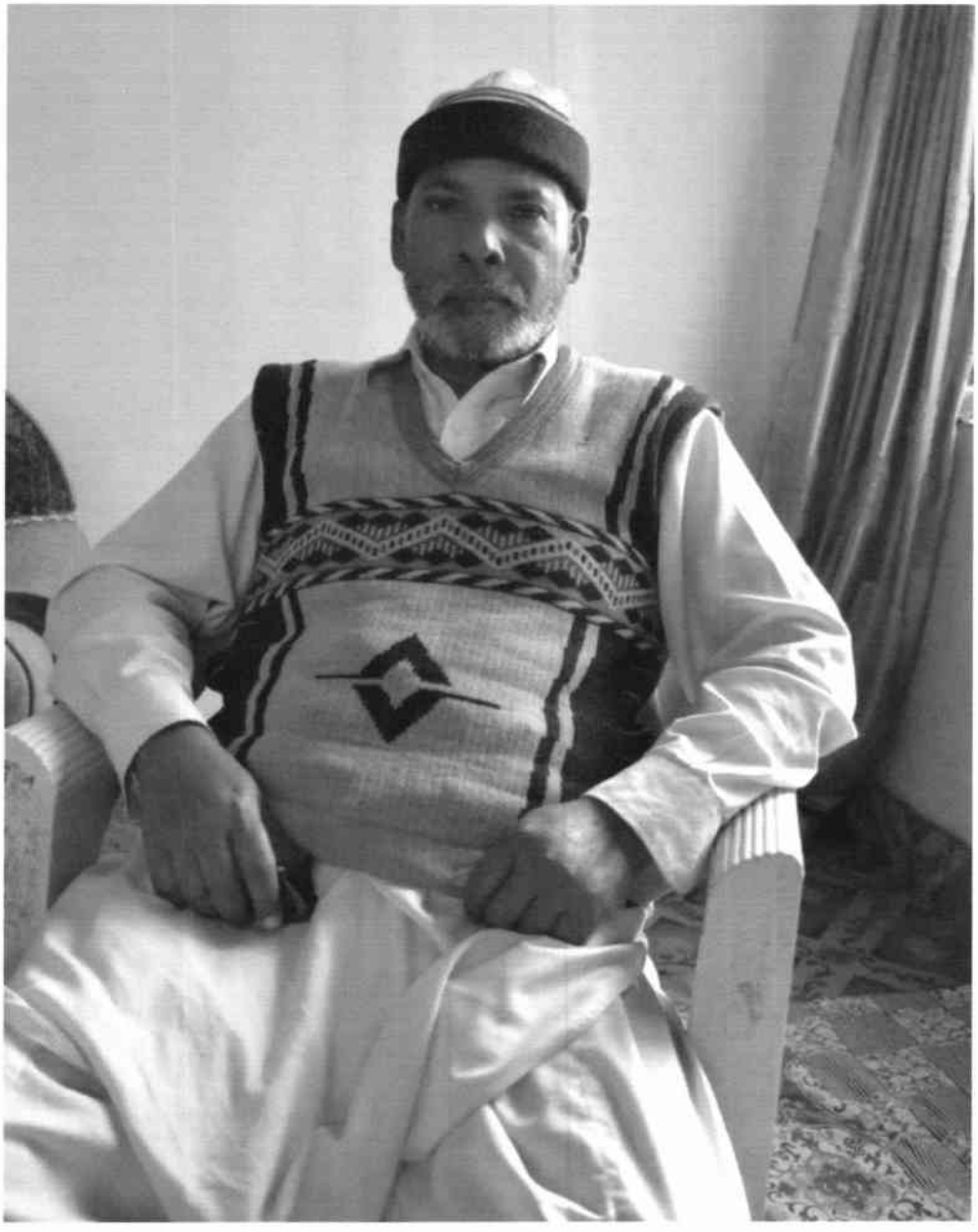

محمد دل شیر علی انصاری نامی عینی شاہد جو درج بالا تصویر میں موجود ہیں کا تعلق بنگلہ دیش کے علاقے چٹاگانگ (ساگون باغان) سے تھا۔ ۱۹۷۱ء کے وقت یہ ایک طالب علم کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ انہوں نے فسادات کے بہت سے واقعات اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھے تھے۔ خود ان کے اپنے گھر کو کئی بار جلایا گیا۔ ملک کے بگڑتے حالات کے پیشِ نظر والد کو بتائے بغیر اپنے آپ کو رضاکارانہ طور پر پاک آرمی کو پیش کیا تھا۔ آپ نے ۱۹۷۱ء کی جنگ میں حصہ لیا اور قیدی بنے۔

محمد دل شیر علی انصاری کے جسم پر آج بھی جنگ کے دوران کھائے زخموں کے نشان موجود ہیں۔ درج بالا تصویر میں ان کی کمر پہ آئے ایک زخم کا نشان دیکھا جاسکتا ہے۔۔ قیدیوں کو مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) سے مغربی پاکستان بھیجنے کا سلسلہ شروع ہوا تو انہیں بھی اپنا آبائی علاقہ چھوڑنا پڑا، یوں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد قیدی کی حیثیت سے انہیں ہجرت کر کے پاکستان آنا پڑا۔ سقوط کے چار سال بعد ان کی ملاقات ان کے والد سے ہوئی جو اِس دوران ہجرت کر کے مغربی پاکستان آچکے تھے اور راولپنڈی میں مقیم تھے۔ والد سے ملاقات کے بعد کے عرصے سے ان کی رہائش راولپنڈی کی بہاری کالونی میں ہی رہی جہاں یہ اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔

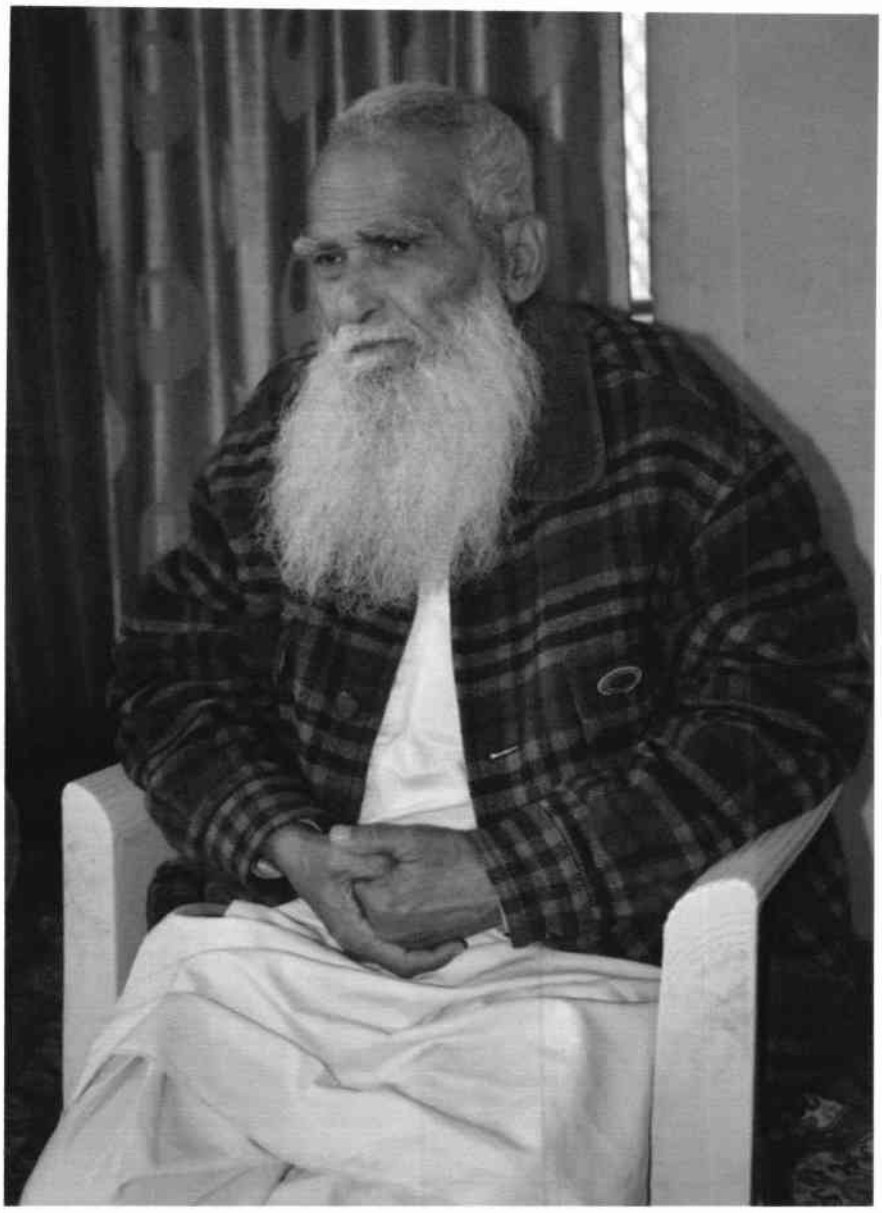

عبدالرؤف نامی عینی شاہد جو درج بالا تصویر میں موجود ہیں ۱۹۷۱ء میں بنگلہ دیش کے علاقے چٹاگانگ میں رہائش پذیر تھے اور اپنا کاروبار سنبھالا کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں پہلی دفعہ اپنے والد کے ساتھ صوبہ بہار سے ہجرت کی تھی۔ تقسیم ہند میں اپنے خاندان کے بہت سے لوگوں کو کھویا اور ۱۹۷۱ء میں ایک دفعہ پھر ہجرت کا دکھ سہا تھا۔ انہوں نے بھی ملک کی خاطر اپنی خدمات پیش کیں۔ ان کے مطابق پاکستان آرمی نے حالات کو اس وقت سنبھالا تھا جب وہ قابو سے باہر ہو چکے تھے اور دورانِ جنگ بھی سپاہی بہت بہادری سے لڑے تھے۔ عبدالرؤف صاحب اس وقت راولپنڈی کی بہاری کالونی میں ایک قابلِ فخر پاکستانی کی حیثیت سے زندگی گزار رہے ہیں۔

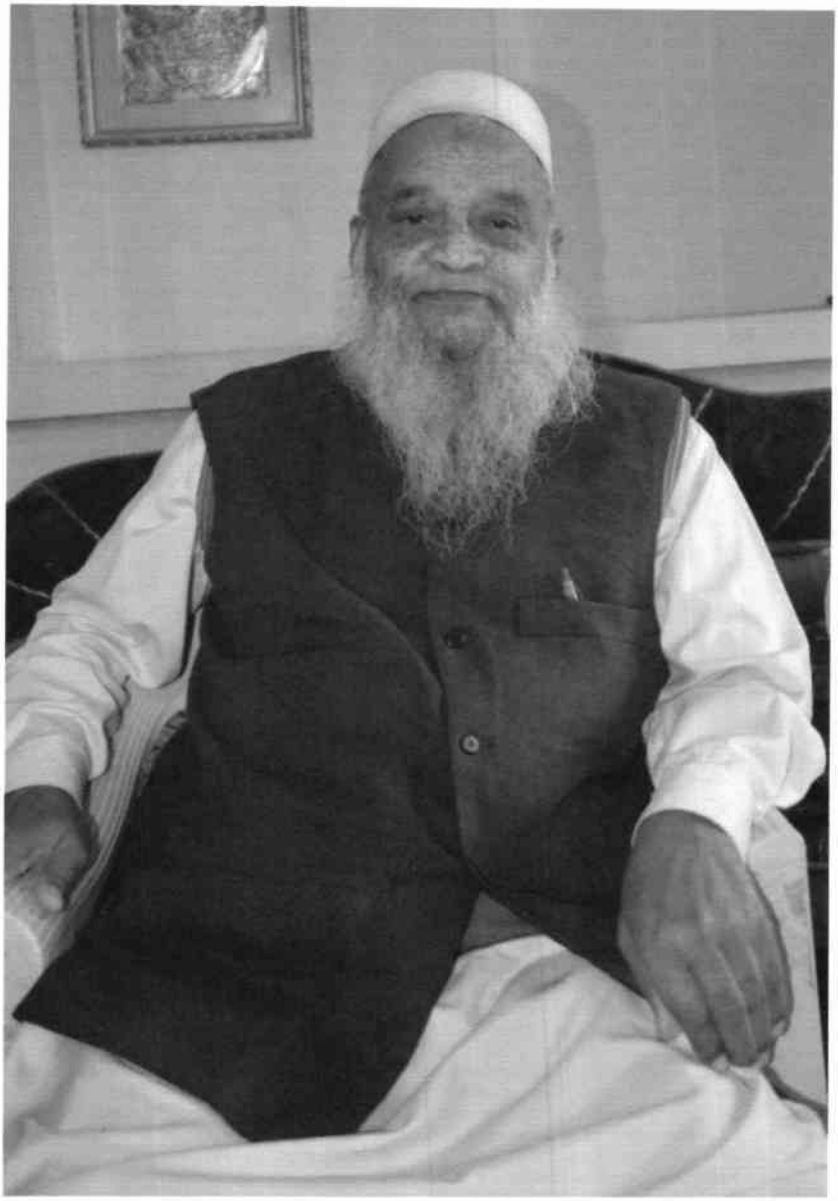

حاجی نصیر الدین نہ صرف ۱۹۷۱ء کے دلسوز واقعے کے عینی شاہد ہیں بلکہ ۱۹۴۷ء میں بھی فسادات کے عالم میں اپنی والدہ اور بھائی کے ساتھ ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آگئے تھے۔ آپ نے تقسیم کے وقت صوبہ بہار سے ہجرت کی تھی اور بنگلہ دیش میں چٹاگانگ (ساگون باغان) میں رہائش اختیار کی۔ نصیر صاحب مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) میں ریلوے کے محکمے میں ملازم تھے۔ پاکستان کی سلامتی کا جذبہ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انہیں افواجِ پاکستان میں شمولیت کے لئے لے گیا۔ 24 فرنٹیر فورس میں شامل ہو کر انہوں نے ملک کی خاطر جنگ لڑی اور بطور جنگی قیدی ہجرت کر کے مغربی پاکستان آگئے۔ آپ راولپنڈی کی بہاری کالونی میں رہائش پذیر ہیں۔ حاجی

نصیر الدین، عبد الرؤف صاحب اور محمد دل شیر علی انصاری صاحب تینوں نے دورانِ قید ایک ہی کیمپ میں تلخ ایام گزارے اور اب راولپنڈی میں زندگی گزار رہے ہیں۔

International Islamic Univ
CENTRAL LIBRARY
ISLAMABAD